شذرات

مسئلۂ قومیت — جاوید احمد غامدی — ۲

قرآنیات

المائدہ (۱۲) — جاوید احمد غامدی — ۵

معارف نبوی

اصل باپ سے نسبت — طالب محسن — ۱۱

دین و دانش

ارتداد کی سزا — محمد عمار خان ناصر — ۱۹

نقطۂ نظر

اسلام اور مغرب — مولانا الطاف احمد اعظمی — ۳۷

سیر و سوانح

عثمان غنی رضی اللہ عنہ (۴) — وسیم اختر مفتی — ۵۹

تبصرۂ کتب

تہذیبی نرگسیت — نعیم احمد بلوچ — ۶۶

ادبیات

تحفہ ملنے پر زروان کے نام — جاوید احمد غامدی — ۷۲


www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

شذرات

جاوید احمد غامدی

# مسئلۂ قومیت

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

رنگ، نسل، زبان، تہذیبی روایات اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم ہونے کا احساس انسان کی فطرت میں ودیعت ہے۔ تمام انسان ایک ہی آدم کی اولاد ہیں، لیکن اپنے رشتہ داروں سے جو قربت محسوس ہوتی ہے، وہ دوسرے انسانوں سے محسوس نہیں ہوتی۔ یہی معاملہ قوم کا ہے۔ انسان جس طرح اپنی شخصیت، خاندان اور اعزہ و اقربا کے حوالے سے اپنی انفرادیت کا اظہار کرتا اور دوسروں سے آگے رہنے اور آگے بڑھنے کا جذبہ اپنے اندر محسوس کرتا ہے، اِسی طرح قوم کے حوالے سے بھی محسوس کرتا ہے۔ اپنی شناخت کا یہی احساس ہے جس سے لوگ مل کر مشترک معاشرت بناتے اور زندگی کے معاملات میں ایک دوسرے کے مددگار بنتے ہیں۔ قرآن نے اِسے تعارف کے لفظ سے تعبیر کیا اور فرمایا ہے کہ شعوب و قبائل اِسی کے پیش نظر وجود میں آئے ہیں۔

اسلام دین فطرت ہے۔ اُس کے نزدیک جو چیز قابل اعتراض ہے، وہ قومیت کی بنیاد پر تکبر ہے، دوسری قوموں سے نفرت ہے، اُنھیں کم تر سمجھ کر مغلوب کرنے، اُن کے حقوق غصب کرنے، اُن کے اور اپنے درمیان اونچ نیچ اور شریف اور کمین کے امتیازات قائم کرنے، اُنھیں ذلیل و حقیر سمجھنے اور اُن کا استحصال کرنے کے داعیات ہیں۔ اِس میں شبہ نہیں کہ اِن میں سے ہر چیز کو وہ انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھتا اور انسانیت کے خلاف بدترین جرم قرار دیتا ہے، لیکن قومیت کی نفی نہیں کرتا، بلکہ اُس کی اُن تمام بنیادوں کو تسلیم کرتا ہے جو علم سیاست میں بالعموم اُس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ قوموں کے مابین مسابقت کے جذبے اور زندگی کے مختلف شعبوں میں اُس کے شایستہ اظہار پر بھی اُسے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ مسلمانوں کے مختلف گروہ اگر اپنی قوم کے حوالے سے اپنا تعارف کرائیں، حقوق کا

مطالبہ کریں یا اپنی کوئی الگ قومی ریاست قائم کرنا چاہیں تو اِسے بھی وہ ناجائز نہیں کہتا۔ لہٰذا یہ نقطۂ نظر کہ اسلام میں قومیت کی بنیاد بھی اسلام ہی ہے، کسی طرح درست قرار نہیں دیا جا سکتا۔ قرآن نے کسی جگہ یہ نہیں کہا کہ مسلمان ایک قوم ہیں یا اُنھیں ایک ہی قوم ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کے اندر اقوام و ملل کا وجود وہ تسلیم کرتا ہے۔ اُس نے جو بات کہی ہے، وہ یہ ہے کہ مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں: 'اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ'۔ قرآن کی رو سے مسلمانوں کا باہمی رشتہ قومیت کا نہیں، بلکہ اخوت کا ہے۔ وہ دسیوں ریاستوں اور بیسیوں ممالک میں تقسیم ہونے کے باوجود ایمان کے رشتے سے ایک دوسرے کے بھائی ہیں۔ اِس لیے یہ تقاضا تو اُن سے کیا جا سکتا ہے اور کرنا چاہیے کہ اپنے بھائیوں کے حالات کی خبر رکھیں، اُن کی مصیبتوں اور تکلیفوں میں اُن کے کام آئیں، وہ مظلوم ہوں تو اُن کی مدد کریں، معاشی اور معاشرتی روابط کے لیے اُنھیں ترجیح دیں اور اُن پر اپنے دروازے کسی حال میں بند نہ کریں، مگر یہ تقاضا نہیں کیا جا سکتا کہ اپنی قومی ریاستوں اور قومی شناخت سے دستبردار ہو کر لازماً ایک ہی قوم اور ایک ہی ریاست بن جائیں۔ وہ جس طرح اپنی الگ الگ قومی ریاستیں قائم کر سکتے ہیں، اِسی طرح دین و شریعت پر عمل کی آزادی ہو تو غیر مسلم اکثریت کی ریاستوں میں شہری کی حیثیت سے اور وطن کی بنیاد پر ایک قوم بن کر رہ بھی سکتے ہیں۔ اِن میں سے کوئی چیز قرآن و سنت کی رو سے ناجائز نہیں ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## البیان
جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

# سورۃ المائدہ

(۱۲)

(گذشتہ سے پیوستہ)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ، لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ مِنَ الَّذِیْنَ قَالُوْٓا:
اٰمَنَّا بِاَفْوَاھِھِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوْبُھُمْ، وَمِنَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا سَمّٰعُوْنَ لِلْکَذِبِ،

تمھیں آزردہ نہ کریں وہ لوگ، اے پیغمبر[99] جو (خدا کی شریعت کے) منکر ہو جانے میں ایک دوسرے سے بڑھنے کی کوشش کر رہے ہیں، وہ بھی جو منہ سے کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں، دراں حالیکہ اُن کے دل ایمان نہیں لائے اور وہ بھی جو یہودی ہو چکے ہیں۔ یہ جھوٹ پر کان لگاتے ہیں، اُن لوگوں کے

[۹۹] اصل الفاظ ہیں: 'یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ لَا یَحْزُنْکَ الَّذِیْنَ یُسَارِعُوْنَ فِی الْکُفْرِ'۔ اِن میں لفظ رسول سے خطاب اِس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے کہ دین کی تبلیغ اور انذار و بشارت سے زیادہ کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں کی گئی۔ آپ نے رسالت کا یہ فرض ادا کر دیا تو اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گئے۔ لوگ نہیں مانتے تو اِس کی پرسش اُنھی سے ہو گی۔ آپ کو اِس معاملے میں آزردہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

"... یہاں چونکہ مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ اور سازشانہ روش پر تسلی دینا اور اِس حقیقت کو واضح کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنت الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے، وہ فتنہ میں پڑ کے رہیں گے، اِس وجہ سے 'یٰٓاَیُّھَا الرَّسُوْلُ' کے خطاب سے آپ کو مخاطب کرنا موزوں ہوا تا کہ خطاب ہی سے آپ کی

سَمّٰعُوْنَ لِقَوْمٍ اٰخَرِيْنَ لَمْ يَاْتُوْكَ، يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ، يَقُوْلُوْنَ: اِنْ اُوْتِيْتُمْ هٰذَا فَخُذُوْهُ وَاِنْ لَّمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوْا، وَمَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا. اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَمْ يُرِدِ اللّٰهُ اَنْ يُّطَهِّرَ قُلُوْبَهُمْ، لَهُمْ فِي

جھوٹ پر جو اِن سے الگ ایک دوسرا گروہ ہیں، جو کبھی تمھارے پاس نہیں آتے[100]، بات کا موقع و محل متعین ہو جانے کے باوجود اُس کو اصل معنی سے پھیر دیتے ہیں[101]، کہتے ہیں کہ تمھارے معاملے کا فیصلہ یہ ہو تو مانو اور نہ ہو تو اُس سے بچ کر رہو[102]۔ (یہ فتنے میں پڑ چکے ہیں) اور جس کو اللہ فتنے میں ڈالنا چاہے، (وہ اُس میں پڑ کر رہتا ہے)، اِس لیے کہ اللہ کے مقابل میں تم اُس کے لیے کچھ بھی نہیں کر سکتے[103]۔ یہی ہیں جن کے

ذمہ داری کی حد آپ پر واضح ہو جائے۔ آگے خطاب کی یہی مضمر حقیقت اِن الفاظ میں یوں واضح فرما دی گئی ہے:
'مَنْ يُّرِدِ اللّٰهُ فِتْنَتَهٗ، فَلَنْ تَمْلِكَ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ شَيْـًٔا'۔" (تدبر قرآن ۲/۵۲۱)

[۱۰۰] اشارہ ہے یہود کے اُن علما اور لیڈروں کی طرف جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں شب و روز جھوٹ گھڑتے اور سامنے آ کر بات کرنے کے بجاے پردے کے پیچھے بیٹھ کر اپنے پیرووں کو آپ کی مخالفت میں سرگرم رکھتے تھے۔

[۱۰۱] اصل میں 'يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ مِنْ بَعْدِ مَوَاضِعِهٖ' کے الفاظ آئے ہیں۔ اِن میں ایک مضاف عربیت کے عام قاعدے کے مطابق حذف ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بات کا موقع و محل اور محمل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اُس کو موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں، اِس لیے صریح تحریف کے مرتکب ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ موقع و محل واضح نہیں ہوتا اور اُس کے انطباق میں غلطی کر جاتے ہیں، لہٰذا معذور ٹھیرائے جا سکتے ہیں۔

[۱۰۲] یعنی خدا کی شریعت کے مطابق اور حق و انصاف کا فیصلہ نہیں چاہتے، بلکہ اپنی مرضی کا فیصلہ چاہتے ہیں۔ چنانچہ آپس میں کہتے ہیں کہ فیصلہ حسب منشا ہو تو قبول کر لیں گے، ورنہ کترا جائیں گے۔

[۱۰۳] یہ اُس سنت الٰہی کا بیان ہے جو ہدایت و ضلالت کے باب میں ہمیشہ سے قائم ہے۔ استاذ امام امین احسن اصلاحی نے اِس کی وضاحت فرمائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"...سنت الٰہی یہ ہے کہ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں، نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے، نہ اہل حق کی نصیحتوں سے، وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

الدُّنۡیَا خِزۡیٌ وَّلَھُمۡ فِی الۡاٰخِرَۃِ عَذَابٌ عَظِیۡمٌ ﴿۴۱﴾ سَمّٰعُوۡنَ لِلۡکَذِبِ، اَکّٰلُوۡنَ لِلسُّحۡتِ، فَاِنۡ جَآءُوۡکَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَھُمۡ اَوۡ اَعۡرِضۡ عَنۡھُمۡ، وَ اِنۡ تُعۡرِضۡ عَنۡھُمۡ فَلَنۡ یَّضُرُّوۡکَ شَیۡئًا، وَاِنۡ حَکَمۡتَ فَاحۡکُمۡ بَیۡنَھُمۡ بِالۡقِسۡطِ، اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ

بارے میں اللہ نے نہیں چاہا کہ اِن کے دلوں کو پاک کرے۔[104] اِن کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ایک بڑی سزا ہے۔ یہ جھوٹ پر کان لگاتے اور (جھوٹی گواہی کے لیے) بغیر کسی تردد کے حرام کھاتے ہیں،[105] لہٰذا (فیصلوں کے لیے) تمھارے پاس آئیں تو تمھیں اختیار ہے کہ اِن کا فیصلہ کرو یا ٹال دو۔ تم اِنھیں ٹال دو گے تو یہ تمھیں کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے[106] اور اگر فیصلہ کرو گے تو تم پر لازم ہے کہ

اِس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ اُن کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم و حوصلہ سرے سے باقی رہ ہی نہیں جاتا، باطل ہی اُن کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ اُن کو کتنا ہی جھنجھوڑیے اور جگایے، لیکن وہ یہ بستر چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ یہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اِن کو اِس فتنے ہی میں اوندھے منہ پڑے چھوڑ دیتا ہے جس میں وہ پڑ چکے ہوتے ہیں۔'' (تدبر قرآن ۲/ ۵۲۳)

[۱۰۴] اِس لیے نہیں چاہا کہ دلوں کی تطہیر کے لیے اللہ تعالیٰ کا ایک خاص ضابطہ ہے جس کے مطابق یہ اِس کے مستحق نہیں رہے کہ اللہ اِن کے دلوں کو پاک کرے۔ استاذ امام لکھتے ہیں:

''...جو لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں، اگر اثناے راہ میں اُن کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے، وہ گر پڑتے ہیں، لیکن گرنے کے بعد پھر اُٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعے سے دامن جھاڑ کے پھر چل کھڑے ہوتے ہیں، تو خواہ ہزار بار گریں اور اُٹھیں، لیکن اُن کے دامن دل پر میل جمنے نہیں پاتا، اللہ اُن کی توبہ و اصلاح کو اُن کے لیے کفارۂ سیئات بناتا رہتا ہے۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنا لیتے ہیں اور گناہوں کی کیچڑ ہی میں لت پت رہتے ہیں، اُن میں لذت و راحت محسوس کرتے ہیں، آہستہ آہستہ اُن کے دلوں پر اتنی سیاہی جم جاتی ہے کہ اُن پر کوئی صیقل بھی کارگر نہیں ہوتا، پھر خدا اُنھیں جہنم کی بھٹی ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہے۔''

(تدبر قرآن ۲/ ۵۲۴)

[۱۰۵] یعنی جھوٹ کے رسیا ہیں۔ چنانچہ جھوٹی گواہی دین و شریعت کے کسی معاملے میں دینی پڑے یا کسی مقدمے میں، یہ ہر وقت تیار رہتے اور اس کے لیے رشوت لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔

الْمُقْسِطِيْنَ ﴿۴۲﴾ وَكَيْفَ يُحَكِّمُوْنَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرٰةُ، فِيْهَا حُكْمُ اللّٰهِ، ثُمَّ يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذٰلِكَ، وَمَآ اُولٰٓئِكَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۴۳﴾

انصاف کے ساتھ فیصلہ کرو۔ اللہ اُنھی لوگوں کو پسند کرتا ہے جو انصاف کا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ تم سے کس طرح فیصلہ کراتے ہیں، درآں حالیکہ اِن کے پاس تورات ہے جس میں اللہ کا فیصلہ موجود ہے،[107] پھر فیصلے کے لیے رجوع کر لینے کے بعد اُس سے بھی برگشتہ ہو جاتے ہیں۔[108] حقیقت یہ ہے کہ یہ ماننے والے لوگ ہی نہیں ہیں۔ ۴۱-۴۳

[۱۰۶] مطلب یہ ہے کہ اِن کی تمام سازشیں بے نقاب ہو جائیں گی۔ اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اِن کا پردہ اٹھا دے گا۔ چنانچہ تم اِنھیں ٹال بھی دو تو اِس کی بنا پر تمھارے خلاف پروپیگنڈا کر کے یہ تمھیں اور تمھاری دعوت کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

آیت کے الفاظ سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ اہل کتاب اگر مسلمانوں کی حکومت میں اپنی شریعت کے مطابق اور اپنے علما و فقہا کی عدالتوں سے فیصلہ کرانا چاہیں تو اِس میں کوئی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ آگے کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی طریقہ اللہ تعالیٰ کو پسند بھی ہے۔ اِس لیے کہ جب تک وہ قرآن پر ایمان نہیں لاتے، اُن کے لیے زیبا یہی ہے کہ وہ تورات و انجیل کی طرف رجوع کریں۔ یہ اللہ کی کتابیں ہیں اور کوئی مسلمان اُنھیں اللہ کی کتابوں پر عمل کرنے سے روکنے کی جسارت نہیں کر سکتا۔

[۱۰۷] یہ اِس بات پر اظہار تعجب ہے کہ تورات کو مانتے ہیں اور تم کو نہیں مانتے، لیکن محض اِس وجہ سے کہ تورات کا قانون کسی معاملے میں قابل قبول نہیں ہوتا تو اپنے مقدمات تمھارے پاس لے آتے ہیں تاکہ حسب منشا کوئی فیصلہ اگر حاصل ہو جائے تو کہہ سکیں کہ تورات کو چھوڑ کر ہم نے کوئی جرم نہیں کیا ہے۔ ہم نے تو خدا کے پیغمبر کا فیصلہ قبول کیا ہے۔

اِس سے یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ خدا کا قانون اگر قانون کی حیثیت سے دیا گیا ہے تو اُس پر عمل بجائے خود مطلوب ہوتا ہے۔ اُس کے مقاصد کو سامنے رکھ کر کوئی شخص اُس کی جگہ کوئی دوسرا قانون نہیں بنا سکتا۔ آیت میں دیکھ لیجیے، نزول تورات کے کم و بیش پندرہ سو سال بعد بھی اللہ تعالیٰ کا اصرار ہے کہ اُس کے ماننے والے اُس کے احکام کے پابند ہیں۔ اِس کے بعد کسی مسلمان کے لیے یہ بات کس طرح جائز ہو سکتی ہے کہ اللہ کے قانون کو ایک طرف رکھ

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کر وہ اُس کے مقاصد کی رعایت سے اپنے لیے خود کوئی قانون بنالے؟ آیت کے سیاق وسباق سے واضح ہے کہ یہ حدود ہی کے احکام تھے جن سے فرار کے لیے یہود نے مختلف قسم کے حیلے نکالنے کی کوشش کی۔ اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا ہے کہ یہ صرف ظالم، فاسق اور کافر ہی ہیں جو اُس کے احکام سے اِس طرح فرار کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔

[۱۰۸] یعنی حق وانصاف کا فیصلہ حاصل کرنے کی خواہش چونکہ شروع ہی سے نہیں تھی، اِس لیے پہلے رجوع کرتے ہیں، مگر تمھارا فیصلہ اگر مرضی کے مطابق نہ ہو تو اُس سے بھی برگشتہ ہو جاتے ہیں۔

[باقی]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

طالب محسن

# اصل باپ سے نسبت

عَنْ أَبِی ذَرٍّ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ أَنَّہُ سَمِعَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: لَیْسَ مِنْ رَجُلٍ ادَّعٰی لِغَیْرِ أَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُہُ إِلَّا کَفَرَ. وَمَنِ ادَّعٰی مَا لَیْسَ لَہُ فَلَیْسَ مِنَّا وَلْیَتَبَوَّأْ مَقْعَدَہُ مِنَ النَّارِ. وَمَنْ دَعَا رَجُلًا بِالْکُفْرِ أَوْ قَالَ: عَدُوَّ اللّٰہِ وَلَیْسَ کَذٰلِکَ إِلَّا حَارَ عَلَیْہِ.

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

---

حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا کہ کوئی آدمی ایسا نہیں ہے جو اپنے آپ کو اپنے باپ کے علاوہ کسی اور سے منسوب کرے، درآں حالیکہ وہ (اصل حقیقت) جانتا تھا، مگر یہ کہ اس نے کفر کیا۔ جو کسی ایسی چیز کا مدعی ہوا جو اس کی نہیں تھی تو وہ ہم میں سے نہیں اور وہ اپنا ٹھکانا آگ میں بنا لے۔ اور جس نے کسی آدمی کو کفر کی نسبت سے بلایا یا یہ کہا کہ تم اللہ کے دشمن ہو اور وہ ایسا نہ ہوا تو یہ اسی کی طرف پلٹے گا۔

عَنْ أَبِی ھُرَیْرَۃَ رَضِیَ اللّٰہُ عَنْہُ یَقُوْلُ: إِنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ: لَا تَرْغَبُوْا عَنْ آبَائِکُمْ. فَمَنْ رَغِبَ عَنْ أَبِیْہِ فَھُوَ کُفْرٌ.

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنے آبا سے انحراف نہ کرو۔ جس نے اپنے باپ سے انحراف کیا، وہ کفر ہے۔

عَنْ سَعْدِ ابْنِ أَبِی وَقَّاصٍ یَقُوْلُ: سَمِعَ أُذُنَایَ مِنْ رَسُوْلِ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ وَھُوَ یَقُوْلُ مَنِ ادَّعٰی أَبًا فِی الْإِسْلَامِ غَیْرَ أَبِیْہِ یَعْلَمُ أَنَّہُ غَیْرُ أَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ.

---

حضرت سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہ) بیان کرتے ہیں کہ ان کے کانوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا، آپ فرما رہے تھے: جس نے اسلام میں اپنے آپ کو کسی اور باپ سے منسوب کیا، جبکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کا باپ نہیں ہے تو اس پر جنت حرام ہے۔

عَنْ سَعْدٍ وَأَبِی بَکْرَۃَ کِلَاھُمَا یَقُوْلُ: سَمِعْتُہُ أُذُنَایَ وَوَعَاہُ قَلْبِی مُحَمَّدًا صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَقُوْلُ: مَنِ ادَّعٰی إِلٰی غَیْرِ أَبِیْہِ وَھُوَ یَعْلَمُ أَنَّہُ غَیْرُ أَبِیْہِ فَالْجَنَّۃُ عَلَیْہِ حَرَامٌ.

---

حضرت سعد اور ابو بکرہ رضی اللہ عنہما، دونوں نے بیان کیا ہے کہ میرے ان کانوں نے سنا اور میرے دل نے یاد رکھا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا: جس نے اپنے آپ کو کسی اور کا بیٹا قرار دیا، جبکہ وہ جانتا تھا کہ وہ اس کا باپ نہیں ہے تو جنت اس پر حرام ہے۔

## لغوی مباحث

'حَارَ عَلَیْہِ': 'حار'، 'رجع' کے معنی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اس روایت میں یہ اسی معنی میں آیا ہے۔

'اِدَّعٰی': 'اِدَّعٰی' کا لفظ بالعموم دعویٰ کرنے کے معنی میں آتا ہے، لیکن اس روایت میں یہ 'اِنْتَسَبَ' کے معنی میں استعمال ہوا ہے، یعنی اپنے آپ کو کسی شخص کی طرف منسوب کرنا۔ روایت میں چونکہ باپ کے بارے میں غلط نسبت کا معاملہ زیر بحث ہے۔ چنانچہ ہم نے ترجمہ کرنے میں یہی پہلو ملحوظ رکھا ہے۔ یہ واضح ہے کہ اس معنی میں بھی دعوے کا پہلو موجود ہے۔

'فَالْيَتَبَوَّأْ مَقْعَدَهُ مِنَ النَّارِ': جملہ فعل امر سے شروع ہوا ہے۔ چنانچہ اس کا ترجمہ کرتے ہوئے اس اسلوب کو پیش نظر رکھا جاتا ہے، لیکن یہاں یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ امر کا صیغہ جہاں حکم یا اظہار تمنا وغیرہ کے لیے آتا ہے، وہاں بد دعا یا کسی امر کے یقینی نتیجے کو بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں یہ اسلوب آخری معنی کے لیے اختیار کیا گیا ہے، یعنی پھر ایسا شخص اپنے آپ کو آگ کا مستحق بنا لے گا۔

## معنی

ہم نے یہاں چار روایتوں کو ایک ہی عنوان کے تحت نقل کیا ہے۔ پہلی روایت میں تین گناہ بیان ہوئے ہیں۔ ایک غیر باپ کو اپنا باپ قرار دینا، دوسرا کسی شے کے مالک ہونے کا ناحق دعویٰ کرنا اور تیسرے کسی مسلمان بھائی کو کافر قرار دینا۔ تیسرے جرم کے بارے میں وہی بات کہی گئی ہے جو پچھلی روایت میں زیر بحث آ چکی ہے۔ چنانچہ یہاں اس روایت کے تحت اس پر تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

باپ، یعنی نسب کے معاملے میں غلط بیانی کا معاملہ خود قرآن مجید میں زیر بحث آیا ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے:

وَمَا جَعَلَ اَدْعِيَآءَكُمْ اَبْنَآءَكُمْ ذٰلِكُمْ قَوْلُكُمْ بِاَفْوَاهِكُمْ وَاللّٰهُ يَقُوْلُ الْحَقَّ وَهُوَ يَهْدِى السَّبِيْلَ. اُدْعُوْهُمْ لِاٰبَآئِهِمْ هُوَ اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ فَاِنْ لَّمْ تَعْلَمُوْٓا اٰبَآءَهُمْ فَاِخْوَانُكُمْ فِى الدِّيْنِ وَمَوَالِيْكُمْ وَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ فِيْمَآ اَخْطَاْتُمْ بِهٖ وَلٰكِنْ مَّا تَعَمَّدَتْ قُلُوْبُكُمْ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا. (۳۳: ۴-۵)

''اور نہ تمھارے منہ بولے بیٹوں کو تمھارے بیٹے بنایا۔ یہ سب تمھارے اپنے منہ کی باتیں ہیں۔ اور اللہ حق کہتا اور صحیح راہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ منہ بولے بیٹوں کو ان کے باپوں کی نسبت کے ساتھ پکارو۔ یہی اللہ کے نزدیک قرین عدل ہے۔ اور اگر تم کو ان کے باپوں کا پتا نہ ہو تو وہ تمھارے دینی بھائی اور تمھارے شریک قبیلہ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اور اس باب میں تم سے جو غلطی ہوئی، اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہیں، البتہ اس بات پر ضرور گرفت ہے جس کا دل سے ارادہ کرو، اللہ درگذر کرنے والا اور رحیم ہے۔''

اس آیت میں اصلاً متبنیٰ کا مسئلہ زیر بحث ہے، یعنی جس بچے کو اپنا بیٹا بنا لیا جائے، اس پر شریعت کے وہ احکام نہیں ہیں جو حقیقی بیٹے سے متعلق ہیں۔ مزید براں قرآن نے یہ ہدایت بھی کر دی کہ جس بچے کے والدین معلوم ہیں، اس بچے کو انھی کی طرف منسوب کرنا چاہیے اور یہ تنبیہ بھی فرما دی کہ تمھارے رب کے نزدیک قرین انصاف

بات یہی ہے۔ اس مقام پر یہ بات بھی فرما دی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسی بات پر گرفت فرمائیں گے جو دل کے ارادے سے کی جاتی ہے۔ اس جملے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ جان بوجھ کر کسی کے نسب کو بدلنا گناہ ہے، لیکن اس مقام سے یہ بات معلوم نہیں ہوتی کہ اس جرم کی سزا ابدی جہنم ہے۔ اسی طرح اس مقام پر اس کو ایک گناہ تو قرار دیا گیا ہے، لیکن اس کے کفر ہونے کا کوئی اشارہ یہاں نہیں ہے۔ روایات میں اس کے برعکس اسے کفر بھی قرار دیا گیا ہے اور اس کے مجرم کو جنت کے حرام ہونے کی وعید بھی سنائی گئی ہے۔

غیر باپ کی طرف انتساب کی برائی کیا ہے۔ متبنیٰ کے باب میں عرب جو غلطی کر رہے تھے، وہ اسے حقیقی بیٹے کے مانند قرار دینا تھا۔ اسے اللہ تعالیٰ نے واضح کر دیا کہ متبنیٰ اصل بیٹا نہیں ہے۔ اس کے بعد کسی متبنیٰ کے اصل نسب کو بدلنے کی ممانعت ہے۔ اس کی خلاف ورزی بھی گناہ ہے، لیکن اس کی وجہ اللہ کی نافرمانی ہے۔ اس کے علاوہ کسی اور محرک کے تحت اگر نسب بدلنے کا معاملہ ہو تو اس کے برے ہونے کی وجہ، مثلاً یہ ہو سکتی ہے کہ اس میں قذف، یعنی تہمت کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے یا یہ کہ یہ والدین کے حقوق ماننے سے انکار ہو سکتا ہے۔ مزید یہ کہ یہ ایک جھوٹ ہے، لیکن یہ کوئی ایسا پہلو بھی نہیں ہے کہ اس کے مرتکب کو کافر قرار دیا جائے۔

سوال یہ ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کفر اور جہنم کی وعید کی بات کس معنی میں فرمائی ہے؟ اس سوال کے متعدد جواب دیے گئے ہیں۔ یہ کہا گیا ہے کہ جنت کے حرام ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ یہ لوگ قیامت کے دن فائز المرام لوگوں میں شامل نہیں ہوں گے اور ان کا معاملہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے معافی ملنے تک معلق رہے گا۔ تکفیر کی توجیہ یہ بات کہہ کر کی گئی ہے کہ باپ سے غلط نسبت کا فعل دور جاہلیت کا فعل ہے، گویا یہ کفار والا کام ہے۔

بعض شارحین کے نزدیک تکفیر سے محض یہ واضح کرنا پیش نظر ہے کہ اس طرح کے اعمال اہل دین کے طریقے سے انحراف ہیں اور کسی مسلمان کو ان کا مرتکب نہیں ہونا چاہیے۔ ہم پچھلی روایت کے تحت یہ بات بیان کر چکے ہیں کہ یہ بیانات قانونی نہیں ہیں، ان سے مقصود کسی برائی کی شناعت اور ان کے مسلمانوں کے کردار سے انتہائی عدم مناسبت واضح کرنا ہوتا ہے، لیکن یہاں ہم قرآن مجید کے حوالے سے ایک اور پہلو بھی واضح کرنا چاہتے ہیں۔ سورۂ بقرہ میں ابلیس کے سجدہ نہ کرنے کا واقعہ بیان ہوا ہے۔ وہاں اللہ تعالیٰ نے انکار کا محرک اور نتیجہ، دونوں بیان کیے ہیں۔ ارشاد ہے:

وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ. (۲:۳۴)

''اور (یاد کرو) جب ہم نے فرشتوں سے کہا: آدم کو سجدہ کرو۔ سوائے ابلیس کے سب نے سجدہ کیا۔ اس نے انکار کیا اور استکبار کیا اور کافروں میں سے ہو گیا۔''

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

واقعہ اصل میں امر الٰہی کی تعمیل نہ کرنے کا ہے۔ اس صورت میں یہ ایک معصیت ہے، لیکن یہاں اس عدمِ تعمیل کے پیچھے انکار اور استکبار تھا۔ چنانچہ اسے کفر قرار دے دیا گیا۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ معصیت کا محرک نتیجے کو تبدیل کر دیتا ہے۔ ہر معصیت اپنے ساتھ یہ خطرہ رکھتی ہے کہ وہ توبہ وانابت کے بجائے ابا و استکبار پر منتج ہو اور یہ استکبار اسے کفر تک پہنچا دے۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی اخلاقی خرابیوں کے ساتھ غیر مسلم ہونے، کافر ہونے یا ایمان سے محرومی جیسے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ ان اسالیب سے جہاں ان خرابیوں اور ایمان میں منافات واضح ہوتی ہے، وہاں ان کے اپنا لینے اور توبہ و اصلاح سے محرومی کے باعث نکلنے والے نتیجے پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

پہلی روایت میں ناحق مدعی بننے پر بھی ایمان سے محرومی اور جہنم کی وعید بیان ہوئی ہے۔ یہ وعید بھی وہ تمام پہلو اپنے اندر رکھتی ہے جو ہم نے اوپر بیان کیے ہیں۔ اس وعید کو بھی ہم قرآن مجید کے ایک مقام سے متعلق کر کے سمجھ سکتے ہیں۔ قرآن مجید میں وراثت کے احکام مکمل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ. وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا خَالِدًا فِيْهَا وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ. (النساء ۴: ۱۳-۱۴)

”یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدیں ہیں۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرتے رہیں گے، اللہ ان کو ایسے باغوں میں داخل کرے گا جن میں نہریں جاری ہوں گی، ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہ بڑی کامیابی ہے۔ اور جو اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کریں گے اور اس کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز کریں گے، ان کو ایسی آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے اور ان کے لیے ذلیل کرنے والا عذاب ہے۔“

ان آیات سے پہلے کی آیات میں خدا نے وارثوں کے حق طے کر دیے ہیں۔ اب وراثت کے قانون کے معاملے میں کسی طرح کا ہیر پھیر دراصل کسی کو اس کے حق سے محروم کرنا ہے۔ یہی معاملہ ناحق دعوے کا ہے۔ جب ہم کسی ناحق دعوے پر کھڑے ہوتے ہیں تو کسی کو اس کے حق سے محروم کر رہے ہوتے ہیں۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے وراثت میں حصے مقرر کیے ہیں، اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کسی کا مال باطل طریقے سے کھانے سے منع کیا ہے۔ جس طرح وراثت میں تبدیلی خدا کے حکم کی نافرمانی ہے، اسی طرح غلط دعویٰ بھی خدا کے حکم کی نافرمانی ہے۔ وہ چیز کیا ہے جو

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.com

جنت سے محرومی کا باعث بنتی ہے، وہ ان آیات میں اللہ کے قائم کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ گویا نافرمانی جب خدا کی اطاعت کے دائرے سے نکل جانے پر منتج ہو جاتی ہے تو انسان خدا کی رحمت اور بخشش کے حق سے بھی محروم ہو جاتا ہے۔

اسی روایت میں 'عدو اللّٰہ' کہنے پر بھی وہی وعید بیان ہوئی ہے جو تکفیر کے ساتھ متعلق ہے۔ 'عدو اللّٰہ' کی تعبیر قرآن مجید سے ماخوذ ہے۔ سورۂ بقرہ میں ہے:

| | |
|---|---|
| مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ. (۲:۹۸) | ''جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبریل و میکائیل کے دشمن ہوئے تو ایسے کافروں کا اللہ دشمن ہے۔'' |

یہ آیت دو باتیں واضح کرتی ہے: ایک یہ کہ اللہ، اس کے رسولوں اور اس کے فرشتوں سے دشمنی رکھنے والا کافر ہے اور دوسرے یہ کہ اللہ بھی ان کا دشمن ہے۔ چنانچہ کسی شخص کو اللہ کا دشمن قرار دینا، درحقیقت اس کی تکفیر ہی ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

## متون

امام مسلم نے اس مضمون کی جو روایتیں دی ہیں، ان سے واضح ہے کہ کسی روایت میں ایک ہی بات بیان ہوئی ہے، کسی میں زیادہ۔ دیگر کتب حدیث میں بھی اس روایت کے متن اسی طرح نقل ہوئے ہیں، کسی میں دو باتیں ہیں، کسی میں تین، کسی میں کوئی ترتیب ہے اور کسی میں کوئی۔ اسی طرح بات کو ادا کرنے کے لیے مختلف اسالیب بھی اختیار کیے گئے ہیں، لیکن مفہوم چونکہ ایک ہی ہے، لہٰذا اختلاف محض لفظی ہے۔ مثلاً 'اِدَّعٰی' کے بجائے 'اِنْتَسَبَ' آیا ہے۔ اسی طرح یہی بات ادا کرنے کے لیے 'لَا تَرْغَبُوْا عَنْ آبَائِكُمْ' کی تعبیر بھی اختیار کی گئی ہے۔ جنت سے محرومی کو بیان کرنے کے لیے جنت کے حرام ہونے کے الفاظ بھی آئے ہیں اور جنت کی خوشبو نہ پانے کے الفاظ بھی روایت ہوئے ہیں۔ اس کے ساتھ یہ تصریح بھی ہے کہ جنت کی خوشبو ستر سال کی مسافت سے آ جاتی ہے۔

## کتابیات

بخاری، رقم ۳۳۱۷، ۶۳۸۵ - ۶۳۸۶؛ مسلم، رقم ۶۱ - ۶۳؛ ابن حبان، رقم ۴۱۵ - ۴۱۷، ۱۴۶۶؛ ابوداؤد، رقم ۵۱۱۵؛ ابن ماجہ، رقم ۲۶۰۹ - ۲۶۱۱؛ سنن بیہقی، رقم ۱۵۱۱۲ - ۱۵۱۱۴؛ سنن دارمی، رقم ۲۵۳۰، ۲۸۶۰؛ مسند احمد بن حنبل، رقم ۱۴۵۴، ۱۴۹۹، ۶۵۹۲، ۶۸۳۴، ۱۰۸۲۵، ۱۷۲۵۱، ۲۱۵۰۳؛ مسند عبد بن حمید، رقم ۴۳۳؛ مسند ابویعلیٰ، رقم ۷۰۰،

۷۰۶،۷۶۵؛ مسند طیالسی، رقم۱۹۹، ۴۸۸۵،۲۲۷۴؛ المعجم الاوسط، رقم۵۶۱؛ مصنف عبدالرزاق، رقم۱۶۳۱۷؛ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۶۱۰۴،۲۶۱۰۵؛ الادب المفرد، رقم ۴۳۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

محمد عمار خان ناصر

# ارتداد کی سزا

[ یہ مصنف کی زیر طبع کتاب ''حدود و تعزیرات ــــ چند اہم مباحث'' کا ایک جز ہے۔ قارئین ''اشراق'' کے افادے کے لیے اس کتاب کے جملہ مباحث بالاقساط شائع کیے جا رہے ہیں۔ ]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

شرعی نصوص میں بیان ہونے والی سزاؤں میں ارتداد کی سزا غالباً موجودہ دور میں سب سے زیادہ زیر بحث آنے والی سزا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دوسری سزاؤں کی طرح یہ سزا محض فروعی احکام کے دائرے تک محدود نہیں رہتی، بلکہ کفر و ایمان کے حوالے سے اسلام کے اصولی تصورات اور دنیا کے دیگر مذاہب کے بارے میں اس کے زاویۂ نگاہ سے مربوط ہو جاتی ہے جو دور جدید میں سب سے زیادہ موضوع بحث بننے والے مباحث میں سے ایک ہے۔

قرآن مجید میں یہ بات جگہ جگہ واضح کی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اس دنیا میں امتحان اور آزمایش کے لیے بھیجا ہے اور اس مقصد کے لیے اسے حق کو قبول کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں پوری آزادی بخشی ہے۔ قرآن مجید کی رو سے ایمان کے معاملے میں اصل اعتبار انسان کے اپنے ارادہ و اختیار کا ہے۔ چنانچہ کسی انسان کے لیے یہ جائز نہیں کہ وہ اس معاملے میں کسی دوسرے انسان کو جبر و اکراہ کے ساتھ ایمان و اسلام کی راہ پر لانے کی کوشش کرے اور نہ اس طرح کے ایمان کو اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں کوئی وقعت حاصل ہے[1]۔ ارادہ و اختیار کی یہ آزادی دنیا میں رشد و ہدایت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی اسکیم کا بنیادی ضابطہ ہے اور اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے دین کے معاملے میں کسی قسم کے جبر و اکراہ کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا[2]۔ اسی آزادی کی بنا پر انسانوں کا مختلف مذہبی گروہوں میں تقسیم رہنا اللہ تعالیٰ کے

قانون آزمایش کا ایک لازمی تقاضا ہے اور ان اختلافات کا حتمی فیصلہ خود اللہ تعالیٰ قیامت کے دن کریں گے۔[3] اسی ضمن میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے سے یہ بات قرآن مجید نے بہت وضاحت سے بیان کی ہے کہ آپ کے ذمے بس اللہ کا پیغام لوگوں تک پہنچا دینا ہے اور اس سے آگے کوئی ذمہ داری آپ پر عائد نہیں ہوتی۔[4]

اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے 'من بدل دينه فاقتلوه' (جو شخص اپنا دین تبدیل کرے، اسے قتل کر دو) کے الفاظ میں واضح طور پر مرتد کو سزاے موت دینے کا حکم دیا ہے۔[5]

قرآن مجید کی مذکورہ تصریحات کی روشنی میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ دنیا آزمایش کے لیے بنائی گئی اور انسانوں کو اپنی آزادانہ مرضی سے ایمان یا کفر کا راستہ اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے تو پھر اسلام سے مرتد ہونے والوں کے لیے قتل کی سزا مقرر کرنے کا کیا جواز ہے اور کیا اس سے خود اسلام کی تعلیمات میں ایک داخلی تضاد پیدا نہیں ہو جاتا؟ اس اشکال کو حل کرنے کے لیے اہل علم کی طرف سے مختلف توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ اس ضمن میں بنیادی طور پر تین زاویہ ہاے نگاہ پائے جاتے ہیں۔ یہاں ہم ان کا تنقیدی جائزہ لیں گے:

۱۔ پہلا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ دین کے معاملے میں جبر واکراہ کو فی نفسہٖ ایک جائز اخلاقی رویہ تصور کرتے ہوئے ارتداد پر سزاے موت کی توجیہ جبر واکراہ ہی کی بنیاد پر کی جائے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ اس نقطۂ نظر کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ بنی نوع انسان کی خیر خواہی اور ان کی اخروی نجات کے تناظر میں اللہ تعالیٰ نے دین حق کے معاملے میں جبر واکراہ کے طریقے کو پسند کیا ہے۔ ان کے نزدیک جبر واکراہ شریعت کے ایک باقاعدہ اصول کی حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ وہ جہاد و قتال کے ذریعے سے دعوت اسلام کو دنیا میں پھیلانے، اہل کفر کو جبر واکراہ کے مختلف طریقوں سے دائرۂ اسلام میں داخل کرنے اور اسلام قبول کرنے والوں کے لیے اس کے دائرے سے نکلنے کی راہ کو سزاے ارتداد کے ذریعے سے مسدود کرنے کے تمام اقدامات کی توجیہ اسی اصول کے مطابق کرتے ہیں۔

---

۱؎ یونس ۱۰: ۹۹-۱۰۰۔

۲؎ البقرہ ۲: ۲۵۶۔

۳؎ ہود: ۱۱۸-۱۱۹۔

۴؎ الانعام ۶: ۱۰۷۔ الشوریٰ ۴۲: ۴۸۔ الغاشیہ ۸۸: ۲۱-۲۲۔

۵؎ بخاری، رقم ۲۷۹۴۔



www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

گویا شاہ صاحب کے نزدیک دراصل اسلام قبول کر کے اس سے پلٹ جانا نہیں، بلکہ کفر بجاے خود اطاعت الٰہی سے سرکشی کے تناظر میں گوارا کیے جانے کا مستحق نہیں اور اس بات کا پورا جواز موجود ہے کہ اس کا راستہ روکنے کے لیے طاقت اور جبر و اکراہ کا طریقہ اختیار کیا جائے۔

جبر و اکراہ کے حوالے سے شاہ صاحب کا یہ نقطۂ نظر فقہا کے ایک بڑے گروہ کے رجحان کا ترجمان ہے اور اپنے پس منظر اور استدلال کے تفصیلی تجزیے کے لیے ایک مستقل بحث کا متقاضی ہے جس کے یہ صفحات متحمل نہیں ہو سکتے۔ یہاں مختصراً یہ عرض کرنا کافی ہوگا کہ قرآن مجید کے نصوص سے جن کا خلاصہ ہم نے بحث کے آغاز میں پیش کیا ہے، کفر و ایمان اور ہدایت و ضلالت کے باب میں اللہ تعالیٰ کی جو اسکیم واضح ہوتی ہے، وہ اس نقطۂ نظر کے نتیجے میں بالکل باطل ہو جاتی ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے کسی نقطۂ نظر کو شرف قبولیت نہیں بخشا جا سکتا۔ اس زاویۂ نگاہ کے حامل اہل علم نے دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کی نفی سے متعلق قرآنی نصوص کو منسوخ قرار دینے یا ان کی تاویل کرنے کا جو طریقہ اختیار کیا ہے، وہ علمی لحاظ سے بے حد کمزور ہے اور ہم نے اپنی کتاب ''جہاد — ایک تقابلی مطالعہ'' میں ان کا تفصیلی تجزیہ کر کے ان کی بے مائیگی کو واضح کیا ہے۔

۲۔ دوسرا زاویۂ نگاہ یہ ہے کہ ارتداد پر سزاے موت کی توجیہ جبر و اکراہ کے بجاے اسلام کے تحفظ اور دفع فساد کے اصول پر کی جائے۔ اس ضمن میں پیش کی جانے والی توجیہات مختلف اور متنوع ہیں:

۱۔ امام ابن تیمیہ نے یہ راے پیش کی ہے کہ مرتد ہونے والا شخص اپنے وجود سے گویا دوسرے مسلمانوں کو بھی ارتداد کی دعوت دیتا اور اس طرح ملت اسلامیہ کے وجود کے لیے ایک خطرے کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ چنانچہ اہل اسلام کو ارتداد کے ان منفی اثرات سے محفوظ رکھنے اور حرمت ملت کو قائم رکھنے کے لیے ایسے شخص کے لیے قتل کی سزا مقرر کی گئی ہے۔[۷]

اس توجیہ پر عہد رسالت کے واقعاتی تناظر میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ارتداد کے لیے موت کی سزا عہد نبوی کے بالکل آخری دور میں اس وقت تجویز کی گئی تھی جب پورا عرب اسلام کے زیرنگیں ہو چکا تھا اور مرتد ہونے والوں کے ارتداد سے مسلمانوں کی جماعت کے متاثر ہونے کا خطرہ بہت حد تک کم ہو چکا تھا، جبکہ اس سے پہلے کے ادوار

---

[۷] ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ ۷/۸۵، ۲۰/۱۰۲۔

[۷] ابن تیمیہ، مجموع الفتاویٰ ۷/۸۵، ۲۰/۱۰۲۔

میں، جب یہ خطرہ حقیقی طور پر موجود تھا
اور مدینہ منورہ کے یہود اس مقصد کے تحت ایک سوچے سمجھے منصوبے پر باقاعدہ عمل پیرا تھے، ارتداد کے سدباب کے لیے کوئی قانونی اقدام نہیں کیا گیا، بلکہ محض اخروی عذاب کی وعید سنائی گئی۔[9] یہاں تک کہ ۶ ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور مشرکین مکہ کے مابین طے پانے والے معاہدۂ حدیبیہ میں مشرکین کی یہ شرط بھی تسلیم کی گئی کہ جو مسلمان نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر قریش کے ساتھ جا ملے گا، کفار قریش اس کو واپس مدینہ بھیجنے کے پابند نہیں ہوں گے۔[10] اس اعتبار سے اس توجیہ میں بیان کیا جانے والا محرک خود اس اولین دور پر منطبق نہیں ہوتا جس میں قانون وجود میں آیا تھا۔

دوسرا اشکال یہ وارد ہوتا ہے کہ یہ توجیہ اپنی نوعیت کے اعتبار سے اصلاً مذہبی استدلال پر نہیں، بلکہ ایک عمومی اخلاقی ضابطے، یعنی ایک مذہبی گروہ کے وجود و بقا کے تحفظ کے اصول پر مبنی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسا استدلال نتیجے کے اعتبار سے کسی ایک مذہبی گروہ تک محدود نہیں رہ سکتا اور اس کا دائرہ منطقی طور پر دوسرے تمام مذاہب تک بھی وسیع ہوگا۔ اب اگر کسی شخص کے ارتداد کو امت مسلمہ کے مفاد کے منافی ہونے کی بنیاد پر ایک ناجائز اقدام قرار دیا جائے اور امت مسلمہ کو اپنے اجتماعی وجود کی حفاظت کے لیے اس پر سزاے موت دینے کا حق حاصل ہو تو اس اصول کی آفاقی و اخلاقی نوعیت کے تناظر میں یہی حق دوسرے مذاہب کو بھی حاصل ہونا چاہیے۔ اس صورت میں یہ اصول تسلیم کرنا پڑے گا کہ دنیا میں تبدیلی مذہب کو کلیتاً ممنوع اور ایسا کرنے والے کو 'فساد فی الارض' کے اصول پر مستوجب قتل قرار دیا جائے، اس لیے کہ ہر مذہب کے ماننے والے، بہرحال اپنے اجتماعی وجود کے تحفظ کا حق رکھتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

پھر یہ سوال اپنی جگہ تشنۂ جواب ہے کہ کسی شخص کا اسلام سے مرتد ہو جانا باقی اہل اسلام کے لیے کیونکر ارتداد کا محرک اور باعث بن سکتا ہے؟ اگر تو مرتد کا نفس وجود اس کا باعث ہے تو جو کفار پہلے سے کفر پر قائم ہیں، ان کا وجود انھیں مستوجب قتل کیوں نہیں ٹھیراتا؟ اور اگر کسی مسلمان کا اسلام سے پھر جانا دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کا موجب ہو سکتا ہے تو وہ اہل کفر جو اسلام اور اس کی تعلیمات پر باقاعدہ علمی وعقلی

---

۸۔ آل عمران ۳: ۷۲۔

۹۔ البقرہ ۲: ۲۱۷۔ المائدہ ۵: ۵۴۔

۱۰۔ ابن ہشام، السیرۃ النبویہ ۴/ ۲۸۵۔

اعتراضات کر کے مسلمانوں میں شکوک وشبہات پھیلانے کی کوشش کرتے ہیں، بدرجۂ اولیٰ اس سزا کے مستحق ہونے چاہییں، اس لیے کہ مرتد کے اسلام سے پھر جانے کا ارادی محرک تو شاید یہ نہ ہو، لیکن اسلام پر اعتراض کرنے والے کفار کا ہدف تو بدیہی طور پر اہل اسلام کے ایمان ویقین کو متزلزل کرنا ہے۔ مزید یہ کہ اگر مرتد کا اسلام سے پھر جانا دوسرے مسلمانوں کے دلوں میں اپنے مذہب کے بارے میں تردد و تذبذب پیدا کر سکتا ہے تو کیا کسی مرتد کے اشکالات وشبہات کے ازالہ میں بظاہر ناکامی کے بعد اسے قتل کر دینا شکوک وشبہات کا موجب نہیں بنے گا؟

ہماری طالب علمانہ رائے میں حرمت ملت کی حفاظت کے جس فائدے کو اس حکم کی بنیادی وجہ اور علت کے طور پر پیش کیا جاتا ہے، وہ زیادہ سے زیادہ اس کا ایک اضافی پہلو ہو سکتا ہے جو کسی طرح بھی اپنی اصل اور اساس کے لحاظ سے حکم کی توجیہ نہیں کر پاتا، بلکہ بعض پہلووں سے خود حکم کی نفی پر منتج ہوتا ہے۔

ب۔ فقہاے احناف سزاے ارتداد کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ مرتد کے لیے قتل کی سزا در اصل ارتداد کی نہیں، بلکہ محاربہ کی سزا ہے، کیونکہ کفر پر اصرار کر کے مرتد مسلمانوں کے ساتھ برسر جنگ ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس کے محاربہ کو دفع کرنے کے لیے اسے قتل کیا جائے گا۔[11] احناف نے اسی اصول پر عورت کو ارتداد کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، اس لیے کہ وہ اپنی جسمانی ساخت کے اعتبار سے اصلاً جنگ و پیکار کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

احناف کا یہ استدلال منطقی اعتبار سے غیر مربوط ہے۔ بنیادی سوال یہ ہے کہ اگر حکم کی علت محاربہ ہے تو صرف اسی مرتد کو قتل کرنا چاہیے جو عملاً اور بالفعل مسلمانوں کے خلاف برسر پیکار ہو، اس لیے کہ نہ یہ ضروری ہے کہ ہر مرتد، اسلام یا اہل اسلام کے خلاف معاندانہ رویہ اختیار کرے اور نہ محض یہ خدشہ یا امکان کہ کوئی شخص مسلمانوں کے خلاف محاربہ کا طریقہ اختیار کر سکتا ہے، اس کو قتل کرنے کے لیے وجہ جواز بن سکتا ہے۔ اگر اس خدشے کو وزن دیا جائے تو بھی زیادہ سے زیادہ وہ بالقوہ محارب قرار پائے گا، اور اس صورت میں جس طرح باقی اہل کفر کو جزیہ کا پابند بنا کر ان کے شر اور فساد سے تحفظ حاصل کیا جا سکتا ہے، مرتد کے ساتھ بھی یہی معاملہ کرنے میں منطقی طور پر کوئی چیز مانع نہیں۔ اس سوال کے جواب میں سرخسی کو محاربہ کے بجاے اعتقادی بنیاد ہی کا سہارا لینا پڑا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ چونکہ

۱۱؎ سرخسی، المبسوط ۱۰/۱۱۰۔

۱۲؎ سرخسی، المبسوط ۱۱/۱۰۳۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مرتد صرف حرابہ کا نہیں، بلکہ دین حق کو جان لینے کے بعد اس کے استخفاف کا بھی مرتکب ہے، اس لیے اس کو دیگر اہل افراد کی طرح جزیہ دے کر زندہ رہنے کی رعایت نہیں دی جا سکتی۔[۱۲] دوسری جگہ انھوں نے اس نکتے کو یوں واضح کیا ہے

کہ چونکہ مرتد، اسلام کی حقانیت سے واقف ہونے کے بعد اسے ترک کرتا ہے، اس لیے اتمام حجت کے اصول کے تحت وہ مشرکین عرب کے مماثل ہے اور جیسے ان کے لیے اسلام قبول نہ کرنے کی صورت میں سزاے قتل تجویز کی گئی تھی، اسی طرح مرتد بھی سزاے موت کا مستحق ہے۔[۱۳] اس طرح احناف کی پیش کردہ توجیہ مآل کار اگرچہ امام شافعی کے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ ہو جاتی ہے جس کے مضمرات پر ہم آیندہ سطور میں گفتگو کریں گے، تاہم یہ سوال پھر باقی رہ جاتا ہے کہ اگر حکم کی اصل علت محاربہ کے بجاے اتمام حجت کے بعد انکار حق ہے تو احناف عورت کو اس سزا سے کس اصول پر مستثنیٰ قرار دیتے ہیں۔

ج۔ مولانا مودودی نے روایتی فقہی استدلال کو اپنے مخصوص اسلوب میں ایک نیا رنگ دیا اور اپنے فہم کے مطابق اسلامی ریاست کے مخصوص سیاسی تصورات کے تناظر میں اس سزا کی عقلی توجیہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کے استدلال کا خلاصہ یہ ہے کہ مرتد کو دراصل اس کے کفر کی سزا دینے کے لیے نہیں، بلکہ اسلامی ریاست کے نظم کو خلل اور انتشار سے محفوظ رکھنے کے لیے قتل کیا جاتا ہے۔ مولانا کا کہنا ہے کہ اسلام چونکہ محض مابعد الطبیعیاتی مفہوم میں ایک ''مذہب'' نہیں ہے، بلکہ ایک پورا نظام زندگی ہے جس کے مخصوص تصورات پر اسلامی معاشرے اور ریاست کی تشکیل کی جاتی ہے، اس لیے اس میں داخل ہونے کے بعد واپس جانے کا راستہ کھلا نہیں رکھا جا سکتا، کیونکہ یہ چیز اس نظام کی تخریب، اس کے اجزاے تعمیر کے انتشار اور اس کی بندش وجود کی برہمی کی اجازت دینے کے مترادف ہوگی۔[۱۴]

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مولانا کے استدلال پر ایک سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر مرتد کو قتل کرنے کی اصل وجہ اسلامی ریاست کو ایسے عناصر سے پاک رکھنا ہے جو اس کے نظم اور استحکام میں اختلال کا باعث ہو سکتے ہیں تو اس کے لیے مرتد کو قتل کر دینا ہی کیوں ضروری ہے اور یہی مقصد اسے اسلامی ریاست کے حق شہریت سے محروم کر کے کیوں حاصل نہیں کیا جا سکتا؟ چنانچہ اپنے استدلال کے منطقی تقاضوں کو نبھانے کے لیے مولانا کو ایک نہایت بنیادی نکتے میں روایتی فقہی

---

۱۳؎ سرخسی، المبسوط ۱۰/ ۱۱۷۔

۱۴؎ مرتد کی سزا ۴۹۔۵۰۔

موقف سے اختلاف کرتے ہوئے یہ تسلیم کرنا پڑا کہ جو شخص ارتداد کی راہ اختیار کرنا چاہتا ہے، اسے یہ حق ہے کہ وہ اسلامی ریاست کی شہریت سے دست بردار ہو کر اس کے حدود سے باہر چلا جائے[15]۔ یہ اس قانون میں ایک ایسی شق کا اضافہ ہے جس کا ثبوت نہ احادیث و آثار میں کہیں ملتا ہے اور نہ فقہا میں سے کوئی اس کا قائل ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر اسلام کے پیش نظر ایک ایسی مخصوص ریاست کا قیام ہے جس کے باشندے قانونی اور سیاسی دائرے میں ریاست کی حاکمیت کو تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ نظریاتی بنیادوں پر بھی پوری طرح اس کے وفادار ہوں اور اس میں غیر مسلم عناصر کا وجود محض بدرجہ مجبوری ہی گوارا کیا جاتا ہے تو پھر ''مصلحانہ جہاد'' کے عنوان سے خود مولانا کے پیش کردہ اس فلسفے کا کیا جواز ہے جس کی رو سے دنیا کی تمام غیر مسلم ریاستوں کا خاتمہ کر کے ایک عالم گیر اسلامی ریاست کا قیام مسلمانوں کا مذہبی فریضہ قرار پاتا ہے؟ اس صورت میں لازماً ایک بہت بڑی اکثریت، جو مختلف اور متنوع مذاہب کی پیروکار ہوگی، اسلامی ریاست کی رعایا کی حیثیت اختیار کر لے گی۔ اب اگر ایک اسلامی ریاست کے استحکام کی ضمانت یہی ہے کہ اس کے باشندوں میں ریاست کے مذہبی نظریے سے اختلاف رکھنے والے لوگ کم سے کم ہوں اور اسی بنا پر ارتداد اختیار کرنے والوں کے لیے اس کے حدود میں رہنے کی کوئی گنجایش نہیں رکھی گئی تو پھر اس ریاست کی سرحدوں کو جہاں تک ممکن ہو محدود رکھنا چاہیے، نہ کہ عالم گیر توسیع کو اس کا ہدف قرار دینا چاہیے۔ ایک طرف نظریاتی بنیاد پر استحکام ریاست اور دوسری طرف اس کے حدود میں عالم گیر توسیع کے باہم متضاد تقاضے آخر کیسے نبھائے جائیں گے؟

پھر یہ کہ عالم گیر اسلامی ریاست کے قیام کے اس تصور کے مطابق اگر کسی وقت پوری دنیا میں اسلام کا سیاسی غلبہ قائم ہو جائے تو اس صورت میں ایک طرف اس کے حق آزادئ رائے اور دوسری طرف اسلامی ریاست کے تحفظ کے متضاد تقاضوں کے مابین تطبیق کی جو صورت مولانا نے تجویز کی ہے، یعنی یہ کہ مرتد کو اسلامی ریاست کی شہریت سے محروم کر دیا جائے، اس پر کیسے عمل کیا جا سکے گا؟ اس لیے کہ اس صورت میں کوئی غیر مسلم ریاست موجود ہی نہیں ہوگی جہاں مرتد اپنے عقیدہ و مسلک کے مطابق زندگی بسر کر سکے۔

مولانا نے اس اعتراض کا بھی کوئی تسلی بخش جواب نہیں دیا کہ اسلام اگر اپنے پیروکاروں کو تبدیلی مذہب پر

---

[15] مرتد کی سزا ۴۸۱، ۴۷-۷۶-۷۷۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

سزاے موت دیتا ہے تو دوسرے مذاہب کو اس کا حق کیوں نہیں دیتا اور اس پر ان کی مذمت کیوں کرتا ہے؟

مولانا نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اسلام چونکہ اپنے آپ کو حق اور دوسرے مذاہب کو باطل قرار دیتا ہے، اس لیے وہ اپنے دعوے کی رو سے دوسرے مذاہب کے لیے یہ حق تسلیم نہیں کر سکتا۔ مولانا اسی بنیاد پر اجتماعی نظم کی حفاظت کا یہ حق صرف صالح نظام کے لیے تسلیم کرتے ہیں[١٦]، لیکن یہ اصل سوال کا جواب نہیں، اس لیے کہ اگر تو قانون کی توجیہ عمومی عقلی و اخلاقی اصولوں پر کی جا رہی ہے، جیسا کہ مولانا کا دعویٰ ہے[١٧] تو پھر ہر مذہب کے پیروکار اپنے مذہب کو حق سمجھ کر ہی اس کی پیروی اختیار کرتے ہیں اور ہر اجتماعی نظام، چاہے وہ اسلام کی نگاہ میں غیر صالح ہی کیوں نہ ہو، انھی اقدار پر مبنی ہوتا ہے جنھیں اس نظام کو اپنانے والے صالح سمجھتے ہیں۔ چنانچہ خالص عقلی استدلال کے دائرے میں ارتداد پر سزاے موت دینے کا حق اسلام اور دیگر مذاہب کو یکساں طور پر حاصل ہونا چاہیے۔ اور اگر صالح اور غیر صالح کا فیصلہ عقل عام کے بجاے مآل کار کسی دینیاتی استدلال کی بنیاد پر کیا جانا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ بحث عقلی توجیہ کے دائرے سے باہر نکل جاتی ہے اور سزا پر وارد ہونے والے عقلی اعتراضات کو رفع کرنے کے لیے یہ سارے پاپڑ بیلنے کی سرے سے ضرورت ہی نہیں رہتی۔

د۔ دور جدید کے بعض اہل علم نے کلاسیکی فقہی موقف سے اختلاف کرتے ہوئے یہ راے ظاہر کی ہے کہ ارتداد پر مقرر کی جانے والی یہ سزا دراصل بالفعل محاربہ اور فتنہ وفساد کی سزا تھی اور اس کا نفس کفر سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کی راے میں چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں اہل ایمان اور اہل کفر، دو واضح گروہوں میں تقسیم تھے اور ان کے مابین جنگ کی حالت مسلسل قائم تھی اور ارتداد اختیار کرنے والے افراد مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو کر اہل کفر کے ساتھ جا ملتے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں اور مفسدانہ کارروائیوں میں شریک ہو جاتے تھے، اس لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے لوگوں کے لیے قتل کی سزا مقرر فرمائی۔[١٨]

یہ راے کئی وجوہ سے درست نہیں لگتی:

اول تو حکم کے الفاظ سے اس کی جو علت واضح طور پر معلوم ہوتی ہے، وہ تبدیلی مذہب ہے، نہ کہ محاربہ۔ 'من بدل

١٦؎ مرتد کی سزا ۵۱، ۶۷۔

١٧؎ مرتد کی سزا ۴۳۔

١٨؎ عمر احمد عثمانی، فقہ القرآن: حدود و تعزیرات اور قصاص ۵۹۵-۵۹۶۔

١٩؎ بخاری، رقم ۲۷۹۴۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

۱۹
دینہ' اور 'کفر بعد اسلامہ'[20]

الفاظ اس مفہوم میں بالکل صریح ہیں کہ یہ حکم ارتداد کے بعد اختیار کیے جانے والے مفسدانہ طرز عمل کے بجائے نفس ارتداد کے تناظر میں دیا گیا تھا۔ چنانچہ حکم کے اولین اور براہ راست مخاطبین، یعنی صحابہ نے بھی اس کا یہی مفہوم سمجھا اور نفس ارتداد پر موت کی سزا دی ہے۔[21] اس ضمن میں بعض روایات میں ارتداد کے لیے 'حارب اللّٰہ ورسولہ وارتد عن الاسلام' یا اس کے ہم معنی جو تعبیر استعمال ہوئی ہے،[22] وہ اپنی جگہ بالکل درست ہے اور اس کا صحیح مفہوم اور محل ہم آگے چل کر واضح کریں گے۔

دوسرے یہ کہ روایات میں مرتدین کے بارے میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے عملی فیصلے ہی منقول نہیں، بلکہ اس کو ایک عمومی قانونی حکم کے طور پر بیان کرنا بھی ثابت ہے۔ اگر یہ حکم انھی مرتدین سے متعلق تھا جنھوں نے زیر بحث توجیہ کے مطابق ارتداد کے بعد مسلمانوں کی حکومت میں ان کا ذمی بن کر رہنا پسند نہیں کیا، بلکہ مسلمانوں کا ساتھ چھوڑ کر ان کے مخالف کیمپ میں شامل ہو گئے تو سوال یہ ہے کہ کیا ان سب کو ان کے انفرادی رویے اور طرز عمل سے قطع نظر محض مخالف کیمپ میں شامل ہونے کی بنا پر قتل کا سزاوار قرار دیا گیا یا یہ حکم صرف معاند اور شر پسند افراد تک محدود تھا؟ اگر یہ کہا جائے کہ مرتد ہونے والے افراد یا گروہوں میں اس طرح کی کوئی تقسیم موجود ہی نہیں تھی اور یہ سب لوگ لازماً محاربہ اور شر پسندی ہی کا رویہ اختیار کرتے تھے تو یہ بات عقل عام کے خلاف ہونے کے علاوہ تاریخی طور پر بھی محتاج ثبوت ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ مرتدین کے انفرادی رویے اور طرز عمل سے قطع نظر ان کا مخالف کیمپ میں شامل ہو جانا ہی ان کے قتل کے لیے کافی وجہ جواز تھا تو اس پر یہ اعتراض وارد ہوتا ہے کہ محارب کفار کے خلاف قتال کا حکم تو بے شک ثابت ہے اور جنگ کی حالت میں ان کو قتل کرنا بھی بدیہی طور پر جائز ہے، لیکن بالفعل جنگ کی حالت کے بغیر محض دشمن گروہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر ان کے افراد کو قتل کرنے کی اجازت قرآن وسنت سے ثابت نہیں، بلکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے سریہ نخلہ میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جانے والے مشرکین کے مقتول عمرو بن الحضرمی کی باقاعدہ دیت ادا کی تھی،[23] جبکہ زیر بحث توجیہ کی رو سے مرتد محض اس بنا پر قتل کا مستحق قرار پاتا ہے کہ وہ دشمنوں کے

---

[20] نسائی، رقم ۳۹۵۲۔

[21] نظائر کے لیے دیکھیے: ابوالاعلیٰ مودودی، مرتد کی سزا ۱۹۱-۲۳۔

[22] بخاری، رقم ۶۳۹۰، ۴۲۴۴۔ نسائی، رقم ۳۹۸۰۔

[23] ابن کثیر، البدایہ والنہایہ ۳/ ۲۶۳۔



www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

گروہ میں شامل ہو گیا ہے۔

فرض کیجیے کہ دشمن گروہ سے تعلق رکھنے والا ہر فرد مباح الدم تھا تو ظاہر ہے کہ قتل کی یہ عمومی اباحت مرتدین کو بھی شامل ہو گی، پھر ان کے لیے خصوصی طور پر یہ سزا بیان کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ اگر یہ کہا جائے کہ مرتد ہونے والوں میں معاندین اور غیر معاندین کی تقسیم موجود تھی اور قتل کا حکم خاص طور پر معاندین اور مفسدین ہی کے لیے دیا گیا تھا تو اس تخصیص کے حق میں کوئی قرینہ مفقود ہونے کے علاوہ یہ بات بھی ناقابل فہم ہے کہ ایسے افراد کو، جو ظاہر ہے کہ اسلامی حکومت کے دائرۂ اختیار (Jurisdiction) سے باہر جا چکے تھے، قتل کر دینے کے حکم کا محل کیا تھا، اس کا مخاطب کون تھا اور اس پر عمل درآمد کی کیا صورت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش نظر تھی؟ اس صورت میں تو کوئی قانونی حکم بیان کرنے کے بجائے زیادہ موثر اقدام یہ ہوتا کہ آپ کعب بن اشرف اور ابورافع کی طرح ایسے افراد کے قتل کے لیے خفیہ مہمیں بھیجتے، جبکہ اس نوعیت کی کسی ایک مہم بھیجنے کا ذکر بھی ذخیرۂ سیرت میں نہیں ملتا اور اس طرح کے تمام افراد، مثلاً ابن خطل وغیرہ سے اسی وقت تعرض کیا گیا جب مثال کے طور پر فتح مکہ کے بعد وہ مسلمانوں کے قانونی دائرۂ اختیار میں آ گئے۔

خلاصہ یہ ہے کہ زیر بحث رائے کے پس منظر میں جو ذہنی اشکال کارفرما ہے، وہ اپنی جگہ درست ہے، لیکن اس کو حل کرنے کے لیے ارتداد پر سزاے موت کے حکم کی توجیہ دشمن عناصر سے اسلامی ریاست کے تحفظ کے تناظر میں کرنا مختلف پہلوؤں سے بعید از قیاس اور مبنی بر تکلف دکھائی دیتا ہے۔

۳۔ سزاے ارتداد کی توجیہ کے حوالے سے تیسرا زاویۂ نگاہ، جو سب سے زیادہ قرین قیاس ہے، امام شافعی نے پیش کیا ہے۔ وہ اس کو 'اتمام حجت' کے اصول پر مبنی قرار دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ خدا کے دین کی حقانیت سے پوری طرح واقف ہو جانے اور اس کا اقرار واعتراف کر لینے کے بعد اس کو چھوڑ دینا ایک بہت بڑا گناہ ہے، اور اسی گناہ کی پاداش میں مرتد کو شرعاً مستوجب قتل قرار دیا گیا ہے۔[۲۴] اس ضمن میں دو نکتوں کی تنقیح، البتہ ضروری ہے:

ایک یہ کہ کیا اتمام حجت کے بعد مرتد ہونے والے شخص کو قتل کرنا دین کے معاملے میں جبر واکراہ کے تحت نہیں آتا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں دین کے معاملے میں جبر واکراہ کی نفی دو حوالوں سے کی گئی ہے: ایک تکوینی نظام کے دائرے میں اور دوسرے انسانی اخلاقیات کے تناظر میں۔ پہلی بات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اگر چاہتے



www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کہ تمام انسان تکوینی طور پر ایمان کے حامل ہوں اور انھیں کفر کا اختیار ہی حاصل نہ ہو تو وہ ایسا کر سکتے تھے، لیکن انھوں نے انسانوں کا امتحان لینے کی غرض سے ایمان کو جبراً انسانوں پر مسلط نہیں کیا۔ چنانچہ کوئی انسان تکوینی طور پر ایمان قبول کرنے پر مجبور نہیں، بلکہ اسے کفر یا ایمان میں سے کوئی بھی راستہ اختیار کرنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ دوسری بات کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کسی انسان کو یہ اختیار نہیں دیا کہ وہ اللہ کی دی ہوئی یہ آزادی کسی دوسرے انسان سے چھیننے کی کوشش کرے۔ انسان کا کام بس یہ ہے کہ وہ حق بات کو موثر طریقے سے دوسروں تک پہنچانے کا اہتمام کرے۔ کسی دوسرے انسان کو طاقت کے زور پر حق کی اطاعت پر مجبور کرنے کا اختیار اللہ نے کسی انسان کو نہیں دیا، تاہم ان دونوں باتوں سے یہ کسی طرح لازم نہیں آتا کہ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو جو اختیار دیا ہے، اس کو غلط استعمال کرنے پر وہ انسانوں کا محاسبہ بھی نہیں کریں گے۔ کسی کو کوئی اختیار دینے اور پھر اس اختیار کے غلط استعمال پر اسے سزا دینے میں باہم کوئی منافات نہیں، اور اللہ تعالیٰ بھی اپنے دیے ہوئے اختیار کے غلط استعمال پر انسانوں کو سزا دیتے ہیں۔ یہ سزا اپنی کامل صورت میں تو آخرت میں دی جائے گی، لیکن اللہ تعالیٰ نے اس دنیا میں بھی انسانوں کو اس کا نمونہ دکھانے کا اہتمام کیا ہے۔ قرآن مجید نے اس ضمن میں اللہ کے رسولوں اور ان کی قوموں کے واقعات جا بجا نقل کیے ہیں اور ان کے ذریعے سے یہ واضح کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم میں اپنے رسول کو مبعوث کر کے اس کے ذریعے سے حق کو اس قوم پر پوری طرح واضح کر دیتے ہیں اور اس کے باوجود وہ قوم ایمان نہیں لاتی تو اللہ تعالیٰ اس پر عذاب نازل کر کے اسے عبرت کا نمونہ بنا دیتے ہیں۔[25]

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

قرآن مجید کی رو سے یہ کسی انسان کا نہیں، بلکہ خدا کا فیصلہ ہوتا ہے جس میں کسی انسان، حتیٰ کہ خود پیغمبر کو بھی کوئی اختیار حاصل نہیں ہوتا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو جب جزیرۂ عرب میں مبعوث کیا گیا[26] تو خدائی قانون کے یہ دونوں پہلو پوری طرح واضح کر دیے گئے۔ چنانچہ فرمایا گیا کہ 'فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ وَعَلَيْنَا الْحِسَابُ'، یعنی خدا کا پیغام پہنچانا تو پیغمبر کی ذمہ داری ہے، جبکہ منکرین سے حساب لینا خدا کا کام ہے، البتہ سابقہ قوموں کے برعکس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین کے لیے عذاب کی صورت یہ تجویز کی گئی کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں تو انھیں کسی آسمانی آفت کا نشانہ بنانے کے

---

[24] الشافعی، الام ۲/ ۲۵۶۔

[25] اس نقطۂ نظر کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: جاوید احمد غامدی، قانون جہاد ۳۲-۳۸۔ برہان ۱۳۹-۱۴۳۔ ماہنامہ اشراق، مارچ ۲۰۰۶، ۱۸-۲۳؛ اپریل ۲۰۰۶، ۲۱-۲۸۔

بجاے خود اہل ایمان کی تلواروں کے ذریعے سے جہنم رسید کیا جائے۔قرآن نے واضح کیا ہے کہ اہل کفر کے خلاف نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کی یہ جنگ دراصل خدا کا عذاب تھا، چنانچہ فرمایا: 'وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَاْ بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ'، یعنی اللہ چاہتا تو اپنے دین کا انکار کرنے پر ان کفار سے خود انتقام لے لیتا، لیکن اس نے اپنی خاص حکمت کے تحت اہل ایمان کو جانچنے کے لیے انھیں اہل کفر کے مقابلے میں معرکہ آرا کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔ یہی بات 'قَاتِلُوْهُمْ يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ بِاَيْدِيْكُمْ' کے الفاظ میں بیان کی گئی ہے، یعنی تم ان کے خلاف قتال کرو، اس طرح اللہ تعالیٰ تمھارے ہاتھوں سے انھیں عذاب دینا چاہتے ہیں۔ اس جنگ کے آخری مرحلے میں مشرکین عرب کے لیے قتل کی سزا تجویز کی گئی، جبکہ اہل کتاب کے بارے میں کہا گیا کہ انھیں محکوم بنا کر ان پر جزیہ عائد کر دیا جائے جو اس دور میں محکومی اور تحقیر و تذلیل کی ایک علامت تھا۔

اس تناظر میں دیکھا جائے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اگر ارتداد اختیار کرنے والے ان اہل کفر کو قتل کرنے کا حکم دیا جو اتمام حجت کے بعد ایمان لانے کے پابند اور ایسا نہ کرنے کی صورت میں خدا کے عذاب کے مستحق بن چکے تھے تو یہ کسی طرح بھی دین کے معاملے میں جبر و اکراہ کی ممانعت کے عمومی اصول کے خلاف نہیں تھا۔ اسی سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بعض روایات میں ارتداد کے لیے 'حارب اللّٰه و رسوله' کی تعبیر کیوں استعمال ہوئی ہے۔ یہ تعبیر درحقیقت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور میں ارتداد کی قانونی نوعیت کو بیان کرتی ہے اور اس سے مراد یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانا فی نفسہٖ اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ جنگ کے ہم معنی تھا، خواہ مرتد ہونے والا شخص عملاً اسلام اور اہل اسلام کے خلاف کسی قسم کی سرگرمیوں میں ملوث ہوئے بغیر غیر جانب دار رہنے کا اعلان کرے۔ ''محاربہ اور فساد فی الارض'' اور ''توہین رسالت کی سزا'' کے زیر عنوان ہم نے یہ بات واضح کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبین آپ پر ایمان لانے اور مذہبی و سیاسی، ہر دو دائروں میں آپ کی اطاعت کو قبول کرنے کے پابند تھے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی خواہشات کے علی الرغم جزیرۂ عرب میں آپ اور آپ کے لائے ہوئے دین کا غلبہ مقدر کر دیا تھا اور اس کشمکش کے عبوری مراحل میں اگرچہ بہت سے گروہوں کو غیر جانب دار رہنے کا اختیار دیا گیا تھا، تاہم تکمیلی مرحلے میں یہ گنجایش باقی نہیں رہنے دی گئی تھی۔ ارتداد کی سزا ہماری راے میں اسی آخری مرحلے میں نافذ کی گئی اور اس مرحلے میں اسلام کو چھوڑ کر دوبارہ کفر کی طرف پلٹ جانا صریحاً اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محاربہ کے مترادف تھا۔

www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

دوسرا اہم نکتہ اتمام حجت کے تحقق اور اس پر مبنی احکام کے عملی اطلاق سے متعلق ہے۔ اتنی بات تو واضح ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی نیابت میں آپ کے صحابہ نے جن اقوام اور گروہوں کے خلاف جہاد وقتال کا اقدام کیا، ان پر یقینی طور پر اتمام حجت ہو چکا تھا اور آپ کے دعواے نبوت کی صداقت دور اول کی اسلامی سلطنت کے دائرے میں بسنے والے اہل کتاب پر بالخصوص واضح تھی۔ چنانچہ وہ بالعموم نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار کرتے ہوئے آپ کی بعثت کو اہل عرب کے لیے خاص قرار دے کر اپنے آپ کو آپ پر ایمان لانے سے مستثنیٰ قرار دیتے تھے، تاہم سوال یہ ہے کہ پیغمبر کی طرف سے ایک مرتبہ اتمام حجت متحقق ہونے کے بعد کیا یہ زمان ومکان اور حالات کی تبدیلی سے متاثر ہوتا ہے یا تغیر کے اثرات سے بالاتر رہتا ہے؟ اور اگر متاثر ہوتا ہے تو پھر مختلف افراد اور ان کے احوال وظروف میں پایا جانے والا تفاوت اتمام حجت کی کیفیت اور اس پر متفرع ہونے والے احکام پر بھی اثر انداز ہوتا ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں اگر کسی شخص پر اتمام حجت کا تحقق یقینی نہ ہو تو کیا پھر بھی ارتداد کی صورت میں اسے مستوجب قتل قرار دیا جائے گا؟

فقہی روایت کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اہل علم کے ہاں یہ احساس موجود رہا ہے کہ اتمام حجت کی جو کیفیت اور فضا نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کے مخصوص دائرۂ تخاطب میں پائی جاتی تھی، وہ آفاقی نہیں، بلکہ محدود ہے۔ اسی طرح اتمام حجت پر متفرع ہونے والے احکام کی تحدید وتخصیص کے حوالے سے بھی صدر اول ہی سے علمی بحثیں موجود رہی ہیں۔ مثال کے طور پر مشرکین کو قتل کرنے اور اہل کتاب سے 'جزیہ' وصول کرنے کے احکام قرآن مجید میں واضح طور پر دیے گئے ہیں اور ان دونوں حکموں کے حوالے سے یہ سوال زیر بحث رہا ہے کہ ان کی کس حد تک تعمیم کی جا سکتی ہے۔ سیدنا عمر کے دور میں جب فارس کے علاقے مفتوح ہوئے اور اہل کتاب کے علاوہ مجوس بھی اسلامی ریاست کے زیرنگیں ہوئے تو سیدنا عمر اس معاملے میں ایک عرصے تک متردد رہے کہ مجوس نہ مشرکین ہیں اور نہ اہل کتاب تو ان کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ چنانچہ ابتداءً انھوں نے یہی فیصلہ کیا کہ مجوس سے جزیہ وصول نہ کیا جائے، تاہم بعد میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بیان کردہ اس روایت کی بنیاد پر کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجر کے مجوس سے جزیہ وصول کیا تھا، انھوں نے مجوس سے جزیہ لینے کا فیصلہ کیا۔ اسی طرح مشرکین کو قتل کرنے کے حکم کو فقہاے احناف نے مشرکین عرب تک محدود قرار دیا اور اس کی وجہ یہ بیان کی کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم اور آپ کی بعثت خاصہ کا مخاطب ہونے کی وجہ سے اتمام حجت کے بعد انھیں زندہ رہنے کی رعایت نہیں دی جا سکتی تھی، لیکن دنیا کی دیگر مشرک اقوام پر چونکہ خود پیغمبر کے ذریعے سے براہ راست اتمام حجت کا معاملہ نہیں ہوا، اس لیے وہ اس حکم سے مستثنیٰ

ہیں۔[32] برصغیر میں ایک ہزار سال سے زائد عرصے پر محیط مسلم سلطنت کے مختلف ادوار میں، چند استثنائی واقعات کے علاوہ، عمومی طور پر غیر مسلموں پر جزیہ عائد نہیں کیا گیا، جبکہ خلافت عثمانیہ نے اپنے آخری دور میں غیر مسلموں سے جزیہ لینے کے دستور کو باقاعدہ قانونی سطح پر ختم کر دیا۔[33]

خود مرتد کے لیے سزاے موت کے لازم ہونے کے بجاے کسی متبادل سزا کا امکان تسلیم کرنے کا رجحان، بہت محدود دائرے میں سہی، صدر اول کے اہل علم کے ہاں دکھائی دیتا ہے۔ چنانچہ کتب فقہ میں ایک گروہ کی، جن میں ابراہیم نخعی شامل ہیں، یہ راے نقل ہوئی ہے کہ مرتد کو کسی مخصوص مدت تک نہیں، بلکہ مدت العمر توبہ کا موقع دیا جائے جس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اسے قتل نہ کیا جائے۔[34] ابراہیم نخعی کی اس راے کو غالباً مخالف راے کے عمومی شیوع کے تناظر میں محض ان کا تفرد قرار دے کر زیادہ غور وفکر کا مستحق نہیں سمجھا گیا اور اسی وجہ سے فقہی لٹریچر میں اس موقف کی بحث وتمحیص کے حوالے سے زیادہ علمی مواد نہیں پایا جاتا، تاہم ہمارے خیال میں یہ راے محض ابراہیم نخعی کا تفرد نہیں ہے، بلکہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ جیسے بلند مرتبت فقیہ کے ہاں بھی یہ رجحان دکھائی دیتا ہے اور کم از کم ان جیسی شخصیت کی طرف نسبت کے ناتے سے یہ راے ہر لحاظ سے توجہ اور اعتنا کی مستحق ہے۔

انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ جب تستر فتح ہوا تو ابوموسیٰ اشعری نے مجھے سیدنا عمر کے پاس بھیجا۔ میں پہنچا تو سیدنا عمر نے مجھ سے دریافت کیا کہ جحینہ اور اس کے ساتھیوں کا کیا ہوا؟ یہ بنوبکر بن وائل سے تعلق رکھنے والے کچھ افراد تھے جو مرتد ہو کر کفار کے ساتھ جا ملے تھے۔ انس کہتے ہیں کہ سیدنا عمر نے بڑی کرید کرتے ہوئے ان افراد کے بارے میں پوچھا، لیکن میں نے تین مرتبہ ان کی توجہ اس موضوع سے ہٹانے کے لیے کوئی دوسری بات چھیڑ دی۔ آخر ان کے اصرار پر میں نے بتایا کہ انھیں گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا ہے۔ اس پر سیدنا عمر نے انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا۔ انس نے کہا کہ یہ لوگ جو مرتد ہو کر کفار کے ساتھ جا ملے تھے، کیا ان کے لیے قتل کے علاوہ کوئی اور

---

۳۲؎ جصاص، احکام القرآن ۴/ ۲۶۹-۲۷۰۔ سرخسی، المبسوط ۱۰/ ۹۸۔ مرغینانی، الہدایہ ۲/ ۱۶۰۔ آلوسی، روح المعانی ۱۰/ ۷۹۔

۳۳؎ Norman Stillman, *The Jews of Arab Lands in Modern Times*, http://www.nitle.org

۳۴؎ ابن حزم، المحلیٰ ۱۱/ ۱۸۹۔ ابن قدامہ، المغنی ۱۰/ ۷۷۔ ابن حجر، فتح الباری ۱۲/ ۲۷۰۔

صورت بھی ممکن تھی؟ سیدنا عمر نے کہا کہ ہاں، میں انھیں اسلام کی طرف واپس آنے کی دعوت دیتا اور اگر وہ انکار کرتے تو انھیں قید میں ڈال دیتا۔[۳۵] روایت سے واضح ہے کہ سیدنا عمر اس رائے کے حق میں عمومی رجحان رکھتے تھے اور انس بن مالک بھی اس سے پیشگی واقف تھے۔ چنانچہ انھوں نے پہلے اس موضوع پر گفتگو کو ٹالنے اور پھر ابوموسیٰ اشعری کے اقدام کا دفاع کرنے کی کوشش کی جس پر سیدنا عمر نے اپنی مذکورہ رائے ظاہر کی۔ ابن حزم نے نقل کیا ہے کہ فقہا کا ایک گروہ مرتد کو قتل کرنے کے بجاے مدت العمر توبہ کا موقع دینے کا قائل رہا ہے اور انھوں نے اس گروہ کے مستدل کے طور پر سیدنا عمر کے مذکورہ واقعے ہی کا حوالہ دیا ہے۔[۳۶]

ابن عبد البر نے سیدنا عمر کی اس رائے کو جمہور فقہا کے موقف پر محمول کرتے ہوئے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ اگر وہ قید میں ڈالنے کے بعد بھی اسلام قبول نہ کرتے تو سیدنا عمر انھیں قتل کر دیتے، تاہم اس کے لیے انھوں نے کلام سے کوئی داخلی قرینہ پیش نہیں کیا، بلکہ یہ کہا ہے کہ چونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مرتد کو قتل کرنے کا حکم دیا ہے، اس لیے سیدنا عمر اس سے مختلف کوئی بات نہیں کہہ سکتے،[۳۷] حالانکہ ازروے علت سیدنا عمر کی یہ راے ارشاد نبوی کے خلاف نہیں۔ اگرچہ روایت میں ان کی اس رائے کا استدلال نقل نہیں ہوا، لیکن یہ قیاس کرنا غالباً غلط نہیں ہوگا کہ وہ مرتد کے دل میں اسلام کی حقانیت کے حوالے سے واقعی شکوک وشبہات کا امکان تسلیم کرتے ہوئے اتمام حجت کے پہلو سے اس کو قتل کی سزا دینے میں تردد محسوس کرتے اور اس کے بجاے اسے مدت العمر توبہ کا موقع دینے کو شریعت کے منشا کے زیادہ قریب تصور کرتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

بعض روایات اور آثار میں مرتد ہونے والی عورت کو قتل کے حکم سے مستثنیٰ قرار دینے کا ذکر ملتا ہے۔ چنانچہ معاذ بن جبل سے روایت ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے انھیں یمن کا حاکم بنا کر بھیجا تو من جملہ دوسرے احکامات کے یہ حکم بھی دیا کہ اگر کوئی عورت اسلام سے پھر جائے تو اسے اسلام کی دعوت دو۔ اگر وہ توبہ کر لے تو قبول کر لو اور اگر انکار کر دے تو اس سے جبراً توبہ کراؤ۔[۳۸] اسی طرح ابوہریرہ روایت کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں

---

۳۵؎ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۸۶۹۶۔ بیہقی، السنن الکبریٰ، رقم ۱۶۶۶۵۔ ابن عبدالبر، التمہید ۵/ ۳۰۷۔ طحاوی، شرح معانی الآثار ۳/ ۲۱۰۔ ابن حزم، المحلیٰ ۱۱/ ۱۹۱۔

۳۶؎ المحلیٰ ۱۱/ ۱۹۱۔

۳۷؎ الاستذکار ۷/ ۱۵۴۔

۳۸؎ طبرانی، المعجم الکبیر ۲۰/ ۵۳۔

ایک عورت مرتد ہوگئی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے قتل نہیں کیا۔[39]

ایک روایت کے مطابق سیدنا علی کے زمانے میں کچھ لوگ مرتد ہو گئے تو حضرت علی نے ان میں سے بالغ مردوں کو قتل کر دیا اور عورتوں اور بچوں کو غلام بنالیا۔[40] عبداللہ ابن عباس کا فتویٰ یہ نقل ہوا ہے کہ اگر عورتیں اسلام سے مرتد ہو جائیں تو انھیں قتل نہیں کیا جائے گا، بلکہ انھیں محبوس کر کے اسلام کی دعوت دی جائے گی اور اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے گا۔[41] فقہاے تابعین میں سے زہری، ابراہیم نخعی، قتادہ، عطاء، حسن بصری، خلاس اور عمر بن عبدالعزیز سے مرتد ہونے والی عورت کو قتل کرنے کے بجائے قید کرنے یا لونڈی بنا لینے جیسی متبادل سزائیں دینا مروی ہے۔[42] اس کے برعکس بعض دیگر روایات میں مرتد ہونے والی عورتوں کو قتل کرنے کا ذکر بھی ملتا ہے۔[43]

ہمارے نزدیک اگر ارتداد کی سزا کو اتمام حجت کے نکتے کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جائے تو خواتین پر اس سزا کو نافذ کرنے اور انھیں اس سے مستثنیٰ قرار دینے کے دونوں طریقے قابل فہم ہو جاتے ہیں۔ قتل چونکہ کسی بھی جرم کی آخری سزا ہوتی ہے جس کے بعد اصلاح یا توبہ کا کوئی موقع باقی نہیں رہ جاتا، اس لیے کوئی فرد اگر کسی بھی درجے میں رعایت کا مستحق ہو تو اس پر یہ سزا نافذ کرنے کے بجائے کوئی متبادل سزا تجویز کرنا اور توبہ و اصلاح کے دروازے کو اس کے لیے کھلا رکھنا ایک قابل فہم اور معقول بات ہے۔ خواتین کے بارے میں یہ معلوم ہے کہ انسانی تاریخ میں بالعموم انھیں مردوں اور بالخصوص اپنے خاندان کے مردوں کے رجحانات اور اثرات سے آزاد ہو کر اپنی عقل وفہم اور صواب دید کے مطابق خود کوئی فیصلہ کرنے کے مواقع حاصل نہیں رہے اور مذہبی، معاشرتی اور سیاسی معاملات میں انھیں مردوں ہی کے تابع سمجھا جاتا رہا ہے۔ یہ صورت حال اس بات کی مقتضی تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد انکار حق کے معاملے میں انھیں مردوں کے ساتھ یکساں درجے کا مجرم نہ سمجھا جائے، بلکہ ان کے بارے میں فیصلہ کرتے ہوئے زیادہ احتیاط ملحوظ رکھی جائے۔ اس تناظر میں دیکھا جائے تو اتمام حجت کے تحقق کا اطمینان حاصل ہونے کی صورت میں خواتین کو قتل کرنے، جبکہ اس میں شک وشبہ پائے جانے کی صورت

www.javedahmedghamidi.org www.al-mawrid.com

[39] ابن عدی، الکامل فی ضعفاء الرجال ۲/ ۳۸۲، رقم ۵۰۵۔

[40] الطحاوی، شرح معانی الآثار، رقم ۴۷۲۸۔ الطّوسی، تہذیب الاحکام ۱۰/ ۱۳۹۔

[41] مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۹۹۴۔ مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۸۷۳۱۔

[42] مصنف عبدالرزاق، رقم ۱۸۷۲۵-۱۸۷۳۰۔ مصنف ابن ابی شیبہ، رقم ۲۸۹۹۳، ۲۸۹۹۵-۲۸۹۹۶، ۳۲۷۸۰۔

[43] دار قطنی ۳/ ۱۱۸-۱۲۰۔

میں کوئی متبادل سزا نافذ کرنے کے دونوں طریقے درست قرار پاتے ہیں۔

جب صدر اول میں مختلف گروہوں کے حوالے سے اتمام حجت کی کیفیت میں تفاوت محسوس کیا جا رہا تھا تو ظاہر ہے کہ بعد کے زمانوں میں لازمی طور پر اس میں مزید تغیر رونما ہوا۔ چنانچہ امام غزالی نے پانچویں صدی میں یہ رائے ظاہر کی تھی کہ غیر مسلموں کا ایک گروہ تو یقیناً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی حقانیت سے پوری طرح واقف ہے اور اس کے انکار کے نتیجے میں خدا کے عذاب کا مستحق ٹھہرے گا، لیکن وہ غیر مسلم جنھوں نے سرے سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا نام ہی نہیں سنا یا نام تو سنا ہے، لیکن آپ کی نبوی حیثیت اور پیغمبرانہ کمالات واوصاف سے کما حقہ آگاہ نہیں ہیں، ان کے بارے میں یہی امید ہے کہ وہ رحمت الٰہی کے دائرے میں شامل ہو کر نجات پا جائیں گے۔[۴۴] عہد رسالت اور بعد کے ادوار میں فرق وتفاوت کا یہی احساس فقہ اسلامی کے بہت سے قانونی تصورات پر بھی بتدریج اثر انداز ہوا ہے، تاہم اس تدریجی تغیر کا تفصیلی مطالعہ ایک مستقل بحث کا متقاضی ہے۔[۴۵]

بعض معاصر اہل علم نے اسی تناظر میں ارتداد پر سزاے موت کے حوالے سے یہ سوال اٹھایا ہے کہ اتمام حجت کے لیے جو معاون اور سازگار فضا اور جو اسباب ومحرکات اسلام کے دور اول میں موجود تھے، کیا وہ آج بھی اسی طرح موجود ہیں اور کیا معروضی تناظر میں اس سزا کا اطلاق خود حکم کی علت کی رو سے درست ہوگا؟[۴۶] مولانا مودودی بھی، جنھوں نے ارتداد پر سزاے موت کا بھرپور دفاع کیا ہے، یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے ہیں کہ دور جدید میں اسلامی تعلیم وتربیت کے نظام میں نقص اور کافرانہ تعلیم وتربیت کے اثرات کے تحت نئی نسلوں میں اسلام سے فکری انحراف کا میلان اس درجے میں پھیل چکا ہے کہ انھیں قانون ارتداد کے تحت جبراً دائرۂ اسلام میں مقید رکھنے سے ''اسلام کے نظام اجتماعی میں منافقین کی ایک بہت بڑی تعداد شامل ہو جائے گی جس سے ہر وقت ہر غداری کا خطرہ رہے گا۔''[۴۷] ایسے لوگوں کو جبراً اسلام کا پابند بنانے پر مولانا کی تشویش کا اصل پہلو تو وہی ہے جو انھوں نے بیان کیا ہے، تاہم اس سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ دور جدید میں وضوح حق اور اتمام حجت کی کیفیت کے حوالے سے ان کے احساسات کیا ہیں۔ مولانا نے غالباً اسی احساس کے تحت مرتد کے لیے ملک بدر کرنے کی متبادل سزا کا امکان تسلیم، بلکہ تجویز کیا ہے۔

مذکورہ بحث سے واضح ہے کہ ارتداد پر سزاے موت کو اتمام حجت کے نکتے سے متعلق ماننے کی صورت میں یہ سوال بنیادی اہمیت اختیار کر جاتا ہے کہ کسی شخص یا گروہ پر اتمام حجت ہو جانے کا فیصلہ کیسے اور کن بنیادوں پر کیا جائے

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

گا۔ اس ضمن میں جناب جاوید احمد غامدی نے یہ نقطۂ نظر اختیار کیا ہے کہ چونکہ کسی بھی شخص یا قوم پر حجت تمام ہو جانے کا فیصلہ کوئی انسان، حتیٰ کہ خود پیغمبر بھی نہیں کر سکتا، بلکہ اتمام حجت اور اس کی بنیاد پر سزا اور عذاب کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں، اس لیے قتل مرتد کا حکم شریعت کا کوئی عمومی ضابطہ نہیں، بلکہ اس کا تعلق صرف مشرکین بنی اسماعیل سے ہے جن پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اتمام حجت کے بعد براہ راست اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت موت کی سزا نافذ کی گئی تھی اور اسلام قبول کیے بغیر ان کے لیے زندہ رہنے کی کوئی گنجایش باقی نہیں رکھی گئی تھی۔[۴۸]

ہماری رائے میں اس حکم کو مشرکین عرب تک محدود رکھنے کے بجائے اہل کتاب کو بھی اس کے دائرۂ اطلاق میں شامل سمجھنے میں کوئی مانع نہیں، کیونکہ ان کے لیے جزیہ دے کر اپنے مذہب پر قائم رہنے کی اجازت محض ایک رعایت کی حیثیت رکھتی تھی۔ چنانچہ اگر وہ اسلام قبول کرنے کے بعد دوبارہ کفر کی طرف پلٹنا چاہتے تو یہ چیز ان کی دی گئی رعایت کو ختم کر کے ان کے کفر کی اصل سزا کو بحال کرنے کی ایک مضبوط وجہ تھی۔ اس وجہ سے صحابہ کا اس حکم کو مشرکین عرب کے ساتھ خاص سمجھنے کے بجائے اس کو دوسرے گروہوں کے لیے عام سمجھنا ہماری رائے میں درست تھا، البتہ زیر بحث نقطۂ نظر کا یہ پہلو بے حد وزن رکھتا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب کفار سے متعلق دیے جانے والے احکام ایک مخصوص اساس پر مبنی تھے اور ان کی علی الاطلاق تعمیم نہیں کی جا سکتی۔ ہم واضح کر چکے ہیں کہ ارتداد پر سزاے موت دینے کا تعلق انھی اہل کفر سے تھا جن پر اتمام حجت کیا جا چکا تھا اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انھیں سزا دینے کی باقاعدہ اجازت دی گئی تھی۔ اگرچہ کلاسیکی علمی روایت میں معاملے کا یہ پہلو زیادہ توجہ کا مستحق نہیں سمجھا گیا اور فقہا نے بالعموم ارتداد کی سزا کو شریعت کا ایک ابدی حکم ہی شمار کیا ہے، تاہم دور جدید کی بیش تر مسلم ریاستوں میں ارتداد پر سزاے موت نافذ کرنے کا طریقہ اختیار نہیں کیا گیا جو ہماری رائے میں حکم کی علت کی رو سے بالکل درست ہے۔

---

۴۴؎ الغزالی، فیصل التفرقہ ۹۶۔

۴۵؎ ہم نے اپنی زیر ترتیب کتاب ''جہاد ـــــ ایک تقابلی مطالعہ'' میں اس کے بعض پہلوؤں کو واضح کیا ہے۔

۴۶؎ نجات اللہ صدیقی، اسلام، معاشیات اور ادب ۴۱۴۔

۴۷؎ مرتد کی سزا ۵۷۔

۴۸؎ برہان ۱۳۹-۱۴۳۔

نقطۂ نظر

مولانا الطاف احمد اعظمی

# اسلام اور مغرب

[''نقطۂ نظر'' کا یہ کالم مختلف اصحاب فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اکیسویں صدی میں جب دنیا خردمندی اور دانش آموزی کے بام بلند پر فائز ہے، ہر طرف جمہوریت، مذہبی رواداری اور ثقافتی تکثیریت (multiculturalism) کے چرچے ہیں، یہ بدنما اور خردسوز منظر بھی گاہے گاہے دیکھنے کو ملتا ہے کہ کبھی مسلمانوں کی مذہبی کتاب قرآن کے اوراق جلائے جاتے ہیں اور کبھی مختلف طریقوں سے پیغمبرِ اسلام کی توہین و تذلیل کی جاتی ہے، وہ پیغمبر جس کے ماننے والوں کی تعداد دنیا میں عیسائیوں کے بعد سب سے زیادہ ہے۔

اس معاملے میں اہلِ مغرب کا رویہ حد درجہ مخاصمانہ ہے۔ ابھی حال ہی میں، قارئین واقف ہیں، ڈنمارک کے ایک اخبار میں ایسے کارٹون شائع کیے گئے جس میں پیغمبرِ اسلام کو جو دنیا کے لیے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے، ایک دہشت گرد کی صورت میں دکھایا گیا اور قرآن کی آیات کا مذاق اڑایا گیا تھا۔ دوسرے مغربی ممالک کے کئی اخبارات نے ان مذموم کارٹونوں کو اظہار رائے کی آزادی کا بہانہ بنا کر اہتمام کے ساتھ شائع کیا اور اپنے دل کے پھپھولے پھوڑ کر خوش ہوئے۔ ڈنمارک ہی میں دوبارہ ایک ٹی وی پروگرام میں پیغمبرِ اسلام کو نشانۂ استہزاء بنایا گیا۔

اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور ان کی تحقیر میں امریکہ کو قیادت کا مقام حاصل ہے۔ اس کے سابقہ صدر جارج ڈبلیو بش کچھ زیادہ ہی اسلام کے مخالف ہیں۔ اسلامی فاشزم کی اصطلاح ان ہی کے مسموم ذہن نے اختراع کی ہے۔ یہ وہ ملک ہے جس کو اپنی جمہوری اور ثقافتی قدروں اور کارناموں پر ناز بلکہ غرور ہے۔ انسانی

حقوق اور مذہبی آزادی کا سب سے بڑا علم بردار بھی بزعم خود یہی ملک ہے، لیکن تہذیبی برتری کے تمام بلند و بانگ دعووں کے باوجود محض اپنی اقتصادی قوت اور فوجی برتری کے نشے میں وہ اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ ٹھٹول کرنے میں بدتہذیبی کی ساری حدیں پھلانگ چکا ہے۔

عراق کی ابوغریب جیل میں مسلمان قیدیوں کے ساتھ کیا جانے والا سفاکانہ سلوک اس کی تہذیبی برتری کی قلعی کھولنے کے لیے کافی ہے۔ اتنا ہی نہیں، کیوبا کے جزیرہ گوانتاناموبے میں قائم امریکی جیل میں جو صحیح معنی میں عقوبت خانہ ہے، سینکڑوں مسلمانوں کو بغیر مقدمہ چلائے قیدی بنا کر رکھا گیا ہے اور ان کے ساتھ انسانیت سوز سلوک کیا جا رہا ہے۔ اسی جیل میں قرآن کو بیت الخلا کے اندر بہائے جانے کا شرم ناک واقعہ پیش آ چکا ہے۔

خدا کی اس عظیم کتاب پر اسلام کے دشمن یہ الزام عائد کرتے ہیں کہ اس میں غیر مسلموں کے خلاف جنگ و جہاد کی تعلیم دی گئی ہے۔ ہم یہ تو تسلیم کرتے ہیں کہ قرآن میں جنگ و جہاد کی تعلیم دی گئی ہے لیکن یہ بات تسلیم نہیں کرتے کہ جنگ و جہاد کا حکم مطلق طور پر تمام غیر مسلمانوں کے خلاف ہے۔ قرآن میں صرف ان لوگوں کے خلاف لڑنے کا حکم دیا گیا ہے جو مذہبی آزادی کے دشمن، ظالم، جنگ باز اور مفسد ہوں۔ انسانیت کے خلاف جرائم کرنے والوں سے جنگ کرنے کا حکم دے کر اسلام نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے جس کی مذمت کی جائے۔ اگر یہ حکم نہ دیا جاتا تو یقیناً یہ ناانصافی کی بات ہوتی۔ یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اس لڑائی کی اجازت ان مسلمانوں کو دی گئی ہے جو خود مختار ہوں، آزاد علاقہ اور ریاست رکھتے ہوں اور اس بات پر قادر ہوں کہ ظالموں اور شر پسندوں کی واجبی سرکوبی کر سکیں۔

پھر یہ بھی دیکھیں کہ کیا جنگ و جہاد کا حکم صرف قرآن میں ہے، دوسرے مذاہب کی کتابوں میں لڑائی کی تعلیم نہیں دی گئی ہے۔ کیا بائبل میں موسیٰ علیہ السلام اور ان کے پیرووں سے نہیں کہا گیا ہے کہ وہ ارضِ فلسطین پر حملہ کر کے اس پر قبضہ کر لیں[1]۔ خود قرآن میں اس کا ذکر ہوا ہے (سورۂ مائدہ: ۵:۱۲۔) چنانچہ اس حکم کے مطابق موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد ان کے خلیفہ یوشوع علیہ السلام نے فلسطین پر حملہ کر کے اس کے ایک بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ اس

---

[1] تورات میں ہے:

''جب تم یردن سے پار ہو کر زمینِ کنعان میں داخل ہو تو ان سب کو جو اس زمین کے باشندے ہیں اپنے سامنے سے بھگاؤ، ان کی مورتیں فنا کر دو، ان کے سب اونچے مکان ڈھا دو اور ان کو جو اس زمین کے بسنے والے ہیں، خارج کرو اور وہاں آپ بسو کیونکہ میں نے وہ سرزمین تم کو دی ہے کہ اس کے مالک بنو۔'' (کتاب اعداد، باب ۳۳: ۵۰-۵۴) مزید دیکھیں، کتاب استثناء، باب ۳: ۲۴، باب ۲: ۳۰-۳۵

قبضہ کو عیسائی اربابِ علم کیا نام دیں گے؟

آگے بڑھیں، ایک طویل زمانی وقفہ کے بعد اس تاریخی عمل کو دوبارہ دہرایا گیا اور مغربی ممالک بالخصوص برطانیہ کی سرپرستی میں فلسطین کے اندر ایک یہودی ریاست قائم کر دی گئی۔ اس وقت یہ ناجائز یہودی ریاست جو ہٹلر کو ظالم کہتی ہے اور یہودیوں کے قتل عام (holocaust) کا افسانہ دنیا کو سناتی رہتی ہے، فلسطینی مسلمانوں کے خلاف ظلم و ستم اور سفاکیت کی علامت بن چکی ہے۔ لیکن عیسائی دنیا اس قتل و غارت گری پر مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہے۔

عیسائیوں کی مذہبی کتاب انجیل میں بلاشبہ جنگ و جہاد کا ذکر نہیں ہے۔ اس میں ظلم و ستم کے جواب میں عدمِ مدافعت بلکہ زیادہ صحیح بات یہ ہے کہ ظالم کے آگے سرنگوں ہو جانے کی تعلیم دی گئی ہے۔ اس میں کہا گیا ہے کہ اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی اس کے آگے پیش کر دو۔

انجیل میں اس انتہائی ضبط و تحمل کی تعلیم کی وجہ یہ نہیں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جنگ و جہاد کو سرے سے برا سمجھتے بلکہ یہ تعلیم اس لیے دی گئی ہے کہ وہ غلام ملک میں پیغمبر بنائے گئے تھے۔ ظاہر ہے کہ غلامی کی حالت میں جب کہ ان کے پیرووں کی تعداد چند نفوس سے زیادہ نہ تھی، رومی حکمراں کے خلاف جنگ و جہاد کا حکم خود کشی کے مترادف ہوتا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو صلیب دینے کا واقعہ محض یہودیوں کے اس غلط الزام کی وجہ سے پیش آیا کہ وہ رومی حکومت کے باغی ہیں۔

اس تاریخی حقیقت کے باوجود میں تسلیم کرتا ہوں کہ انجیل میں عفو و درگذر کی تعلیم اس کی ایک بڑی اخلاقی خوبی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا عیسائیوں نے اس خوبی کا عملاً احترام کیا اور دشمنوں کے خلاف انتقامی کارروائی سے احتراز کیا؟ جواب نفی میں ہوگا۔ عفو و درگذر تو بڑی بات ہے، انھوں نے قتل و غارت گری کا وہ بازار گرم کیا کہ جس کی مثال تاریخ میں مشکل سے ملے گی۔ صلیبی جنگیں (crusades) انھوں نے شروع کیں۔ دو عالمی جنگیں، جس میں کروڑوں انسانوں کا خون پانی کی طرح بہایا گیا، ان کی ذات سے منسوب ہیں۔ جاپان پر، انسانی تاریخ میں پہلی بار ایٹم بم گرانے والا امریکہ ایک عیسائی ملک ہے، اس بم نے چشم زدن میں لاکھوں جاپانیوں کو موت کی نیند سلا دیا۔ ویت نام پر وحشیانہ بمباری کرنے والا بھی یہی ملک ہے اور اس وقت افغانستان اور عراق کے معصوم مسلمانوں کو جنگ کی بھٹی میں جھونکنے والا بھی امریکہ اور اس کا طفیلی برطانیہ ہے۔ اس وقت ان دونوں بدنصیب ملکوں میں کشت و خون ہو رہا ہے وہ ان کی بربریت اور قلبی شقاوت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ انجیل پر ایمان رکھنے والوں کا یہ اصلی چہرہ ہے

---

۲؎ بھگوت گیتا میں ہے:

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

اور یہ چہرہ کتنا خوفناک ہے۔اس خونی چہرے کو دیکھ کر انسانیت بری طرح لرزہ براندام ہے۔ایسے ظالموں اور قاتلوں کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ اسلامی جہاد پر معترض ہوں۔

ہندو مذہب عیسائی مذہب سے زیادہ قدیم ہے۔اس کی مشہور مذہبی کتاب مہابھارت ہے۔اس کو یہ شہرت گیتا کی وجہ سے حاصل ہوئی جو اسی کا ایک حصہ ہے۔اہلِ علم جانتے ہیں کہ اس کتاب میں تصوف (ویدانت) کی اعلیٰ تعلیم دی گئی ہے۔لیکن اسی کتاب میں کسی اور کی زبان سے نہیں، ہندوؤں کے ایک بڑے اوتار اور معبود کا درجہ رکھنے والے

---

''اے ارجن (پارتھ) تو بزدل نہ بن، یہ تیرے شایانِ شان نہیں ہے۔اے دشمنوں پر فتح پانے والے، اپنے دل کی کمزوری کو چھوڑ کر جنگ کے لیے اٹھو۔''

یہ عبارت بھی دیکھیں:

''جنگ کرنے کے بعد اگر تو مارا جائے تو تجھے جنت (سورگ) ملے گی اور فتح یاب ہوگا تو زمین تیرے اقتدار میں ہوگی۔اس لیے اے کنتی کے بیٹے! جنگ کا عزم کر کے اٹھ۔''

(دیکھیں، شریمد بگوت گیتا، اردو ترجمہ: حسن الدین احمد، قومی کونسل برائے فروغ اردو نئی دہلی ۱۹۹۷ء باب دوم ص ۲۴، ۲۸)

''اے اندر! ہم کو بہادرانہ سطوت عطا کر، آزمودہ کاری اور اس روز افزوں قوت کے ساتھ جو مالِ غنیمت حاصل کرتی ہے، تیری مدد سے ہم جنگ میں اپنے دشمنوں کو مغلوب کریں، چاہے وہ اپنے ہوں یا پرائے، ہم دشمن پر فتح مند ہوں۔اے بہادر، ہم تیری مدد سے دونوں قسم کے دشمنوں کو قتل کر کے خوش حال ہوں، بڑی دولت کے ساتھ۔''

(رگ وید، باب ۶:۱۱، باب ۸:۱۳)

منو کے 'دھرم شاستر' میں ہے:

''جس راجہ کی فوجیں ہر وقت جنگ کے لے تیار رہتی ہیں، اس سے تمام دنیا خوف زدہ ومرعوب رہتی ہے۔پس ایسے راجہ کو اپنی مستعد فوج کے ساتھ تمام مخلوقات کو اپنا تابعِ فرمان بنانے کی کوشش کرنی چاہیے۔'' (منو دھرم شاستر، باب ۷:۱۰۳)

۳۔ منو کے دھرم شاستر میں شودر کے بارے میں یہ حقارت آمیز الفاظ لکھے ہوئے ہیں:

''ہاتھی گھوڑا، شودر، شیر، سور......ادنیٰ مدارج ہیں جو تاریکی سے حاصل ہوتے ہیں'' (دھرم شاستر، باب ۱۲:۴۳)

یہ عبارت بھی ملاحظہ ہو:

''جو کوئی شودر کو تعلیم دے گا وہ اس شودر کے ساتھ ہی اسم وات نامی جہنم میں جائے گا۔'' (دھرم شاستر، باب ۴:۸۱)

۴۔ شودر اور وید کے تعلق سے لکھا ہے: ''اگر شودر بالارادہ، وید کے الفاظ سن لے تو اس کے کان میں پگھلی ہوئی رانگ ڈال دی جائے اور اگر وہ وید کی عبارت پڑھے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے (گوتم باب ۱۳:۴-۶)

شری کرشن جی کی زبان سے ارجن کو خود ان کے بھائی بندوں یعنی کوروٴں کے خلاف تلوار اٹھانے کا اُپدیش دیا گیا ہے۔ان کی دوسری مذہبی کتابوں میں بھی جنگ کی تعلیم موجود ہے[۲]۔

منو، ہندووٴں کے ایک بڑے مذہبی رہ نما اور قانون ساز گزرے ہیں۔ انھوں نے اپنے دھرم شاستر میں شودروں کو ایک ذلیل مخلوق قرار دے کر ان کی ہر طرح تذلیل کی ہے[۳]۔اس میں صاف لفظوں میں لکھا ہوا ہے کہ اگر کسی شودر کے کان میں وید کے الفاظ پڑ جائیں تو اس میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جائے اور اگر وہ وید کو پڑھنے کی جسارت کر بیٹھے تو اس کی زبان کاٹ لی جائے وغیرہ[۴]۔

ان متذکرہ بالا مذہبی کتابوں میں جنگ و جہاد کی تعلیم کے باوجود آج تک یہ حادثہ کہیں رونما نہیں ہوا کہ موسیٰ علیہ السلام کا کوئی اہانت آمیز کارٹون کسی اخبار میں شائع کیا گیا ہو اور تورات کے اوراق بیت الخلا میں بہائے گئے ہوں۔ دوسرے مذاہب اور ان کی مذہبی کتابوں کے ساتھ بھی بدتمیزی اور بدسلوکی کا کوئی واقعہ آج تک پیش نہیں آیا۔ ہندووٴں کی مذہبی کتاب گیتا کی جنگی تعلیمات کو آج تک کسی نے ہدف تنقید نہیں بنایا، ان کے منوشاستر کو بیت الخلا میں ڈالنے کی شیطانی حرکت بھی کسی نے نہیں کی۔ کسی مغربی دانشور نے بھول کر بھی شری کرشن جی کو دہشت گرد قرار نہیں دیا۔

اس پس منظر میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر مغرب کے اربابِ علم وخرد نے صرف مذہب اسلام، اس کے پیغمبر اور اس کی مذہبی کتاب کے ساتھ ہر طرح کے ظلم و ناانصافی اور ناشائستہ حرکات کو کیوں جائز قرار دے لیا ہے؟

www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

## تاریخی حقائق

اس وقت اسلام کی مخالفت اس لیے نہیں ہو رہی ہے کہ اہلِ مغرب کو پہلی بار معلوم ہوا کہ قرآن میں جنگ و جہاد کی تعلیم دی گئی ہے اور اسی کتاب سے متاثر ہو کر مسلمانوں نے شدت پسندی اور مغربی تہذیب کے خلاف جارحانہ رویہ اختیار کر رکھا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی اسلام دشمنی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ اسلام کے آغاز میں جن تین مذہبی گروہوں نے اسلام کی مخالفت کی اور اس کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینکنا چاہا ان میں عرب کے مشرکوں کے علاوہ یہودی اور عیسائی نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔ عیسائیوں نے ابتدا میں اسلام کی کچھ زیادہ مخالفت نہیں کی۔ حبشہ کے عیسائی بادشاہ نجاشی نے مکہ کے مظلوم مہاجر مسلمانوں کے ساتھ جو کریمانہ سلوک کیا اس سے اسلامی تاریخ کا ہر طالب علم واقف ہے۔

لیکن یہ حسن سلوک اس وقت ختم ہو گیا جب اسلام کو سیاسی عروج حاصل ہوا اور عہدِ خلافت میں ان رومی

مقبوضات پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا جو سرزمینِ اسلام سے ملحق یا اس کے قریب واقع تھے۔ ان ہی ملکوں میں فلسطین بھی تھا جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی جاے پیدائش ہے۔ مسلمانوں نے اسی حصۂ زمین پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آگے بڑھ کر یورپ کے حدود میں داخل ہو گئے۔ عبدالرحمٰن اموی (۷۵۶-۷۸۸ء) نے اندلس (اسپین) میں عیسائیوں کو مغلوب کر کے اسلامی حکومت قائم کر دی، جس کی حدود میں جنوب مغربی فرانس کا علاقہ ایک مدت تک شامل رہا۔

خلافت عثمانی (۱۲۸۸-۱۹۲۴ء) کے زمانے میں مشرقی یورپ کے بہت سے ملکوں پر ترک مسلمانوں نے تسلط حاصل کر لیا تھا۔ اس عرصہ میں سب سے بڑا واقعہ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) کی فتح ہے۔ یہ تاریخی کارنامہ عثمانی حکم راں محمد فاتح نے ۱۴۵۳ء میں انجام دیا۔ سلیمان اعظم (۱۵۲۰-۱۵۶۶) کے زمانۂ حکومت میں بلغراد شہر اور جزیرۂ رہوڈس پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ ۱۵۳۲ میں سلیمان کی فوجوں نے آسٹریا اور جرمنی میں داخل ہو کر دور دور تک فوجی کار روئیاں کیں اور کئی بار یورپ کی متحدہ فوجی قوت کو شکست فاش دی۔

مسلمانوں کی اس غیر معمولی سیاسی اور فوجی برتری اور مذہبی غلبہ نے پوری عیسائی دنیا کو اسلام کے خلاف کھڑا کر دیا۔ اس تصادم کا آغاز صلیبی جنگوں (crusades) سے ہوا۔ پہلی صلیبی جنگ (۱۰۹۶-۱۰۹۹) میں عیسائیوں نے بیت المقدس پر قبضہ کر لیا۔ لیکن تیسری صلیبی جنگ (۱۱۸۹-۱۱۹۲) میں جو سلطان صلاح الدین ایوبی کی قیادت میں لڑی گئی، بیت المقدس پر دوبارہ مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس شکست کی خبر سے پورے یورپ میں صف ماتم بچھ گئی۔ جرمنی، اٹلی، فرانس اور انگلستان کی متحدہ فوجوں نے جن کی تعداد چھ لاکھ تھی، بیت المقدس کو واپس لینے کی جان توڑ کوشش کی اور تین سال تک یہ خونی معرکہ جاری رہا، لیکن صلاح الدین ایوبی نے ان کے عزائم خاک میں ملا دیے اور وہ ناکام و نامراد اپنے اپنے ملک کو واپس چلے گئے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

اس شرم ناک شکست نے مسیحوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف نفرت وعناد کے جذبے کو پوری طرح مستحکم کر دیا۔ اس کام میں ان کے مذہبی طبقہ نے کلیدی رول ادا کیا ہے۔ صلیبی جنگوں کی آگ بھڑکانے والے پوپ پادری ہی تھے۔ ان ایام کے مغربی لٹریچر کا مطالعہ کریں تو معلوم ہو گا کہ عیسائی اربابِ قلم نے کس کس عنوان سے اسلام اور اس کے پیغمبر کی توہین کی ہے۔ انھوں نے رسول عربی صلی اللہ علیہ وسلم کا نام تک بگاڑ دیا یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو مہاونڈ کہا، اس لٹریچر میں اپنے عوام کو گم راہ کرنے کے لیے انھوں نے یہ افسانہ گھڑا کہ مسلمان بت پرست ہیں، وہ مہاونڈ، ٹرواگانٹ اور اپولو کی عبادت کرتے ہیں۔ اس لیے اہلِ توحید یعنی عیسائیوں کا مذہبی فریضہ ہے کہ وہ اس 'بت پرست مذہب' کے ماننے والوں سے جنگ کریں اور ان کو صفحۂ ہستی سے نابود کر دیں۔ سبحان اللہ: برعکس نہند نامِ زنگی کافور

جب تک دنیا میں مسلمانوں کو علمی اور سیاسی غلبہ حاصل رہا، اسلام کے مخالفوں نے منہ کی کھائی اور اہلِ مغرب کی ہر سازش ناکام ہوگئی۔ اہلِ علم جانتے ہیں کہ مسلمانوں کا علمی غلبہ بارہویں صدی عیسوی کے بعد کم ہوتا گیا اور چودھویں صدی تک پہنچ کر تقریباً ماند پڑ گیا۔ البتہ سیاسی غلبہ ترکی خلافت کی صورت میں اٹھارہویں صدی تک قائم رہا، اگرچہ ضعف واضمحلال کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے تھے۔ انیسویں صدی مسلمانوں کے مکمل سیاسی زوال کی صدی ہے۔ بیسویں صدی کے اوائل (۱۹۱۴ء) میں جنگِ عظیم اوّل شروع ہوئی، جس میں ترکی کو شکست ہوگئی اور اس طرح اسلام کی سیاسی شوکت وحشمت کا دور ختم ہوگیا اور ذلت ومحکومی کا دور شروع ہوا جو آج تک جاری ہے۔

اس شکست ونکبت کے ذمہ دار خود مسلمان ہیں۔ جس وقت یورپ ایک طویل اور گہری نیند سے بیدار ہوکر اپنے علمی وسیاسی عزائم کے پر تول رہا تھا، مسلمانوں نے غفلت کی چادر اوڑھ لی اور اس طرح گہری نیند سوئے کہ آج تک جاگنے کا نام نہیں لے رہے ہیں۔ یہ سونا کیا تھا؟ یہ دراصل ان کے ذہنوں کا سونا اور ان کی اخلاقی قوت کا مائل بہ انحطاط ہونا تھا، اور یہی مہلک نیند مسلمانوں کو آج بھی عزیز ہے۔

بہرحال، جب مسلمانوں کی سیاسی بساط اہلِ مغرب نے الٹ دی اور اکثر مسلم ممالک مغرب کی استعماری قوتوں سے شکست کھا کر مغلوب ومحکوم ہوگئے تو اسلام کے دشمنوں نے ایک بار پھر اس کی توہین ومخالفت کا بیڑا اٹھایا۔ لیکن یہ مخالفت عہدِ وسطیٰ کے اعدائے اسلام سے بالکل مختلف طرز کی تھی۔ اوّل الذکر کے پاس علمی دلائل وبراہین کی کمی تھی۔ اور صرف مذہبی تعصب اور دروغ گوئی کے ذریعے سے اپنا کام نکالنا چاہتے تھے۔ لیکن انیسویں صدی کی اسلام دشمن طاقتوں نے مذہب اسلام کے خلاف علمی حربے کا استعمال کیا۔

چنانچہ ان کی ایک جماعت نے جنھیں اصطلاحاً مستشرقین (orientalist) کہا جاتا ہے، اسلامی لٹریچر کا براہِ راست وسیع مطالعہ کیا اور اس میں سے جھوٹے سچے نقائص نکال کر اپنے اعتراضات کی عمارت کھڑی کی۔ اس اعتراض کا اصل نشانہ قرآن اور پیغمبرِ اسلام تھے۔ شاید ہی کوئی قابلِ ذکر مستشرق ہو جس نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت نہ لکھی ہو۔ اس التفاتِ خسروانہ کا مقصد آپ کی سیرت میں داغ دھبّے تلاش کرنا تھا تاکہ مسیحیوں کو بتایا جائے کہ قرآن نہ خدا کی کتاب ہے اور نہ ہی محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سچے رسول ہیں۔ وہ نعوذ باللہ ذہنی طور پر مریض تھے، یعنی مرگی کی بیماری میں مبتلا تھے[5]۔

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جانشینوں کے بارے میں بھی انھوں نے دروغ گوئی کی ہے۔ وہ سب سے زیادہ

[5] ہسٹری آف انٹلکچوئل ڈیویلپمنٹ آف یورپ، جان ولیم ڈریپر، ۱۸۶۴، ج۱، ص ۳۲۰

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

حضرت عمر فاروقؓ سے نالاں دکھائی دیتے ہیں اور اس کی وجہ بالکل واضح ہے۔ ان ہی کے عہد میں رومی سلطنت کا ایک طاقتور بازو ٹوٹ گیا اور فلسطین پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔ اس کے علاوہ نظم حکومت کے اعتبار سے بھی عہد فاروق عہدِ وسطیٰ کی تاریخ کا ایک روشن اور مثالی باب ہے۔ اس تابناک تاریخی حقیقت کو چھپانے کے لیے انھوں نے الزام لگایا کہ مصر میں اسکندریہ کی لائبریری کو خلیفۂ دوم کے حکم سے مسلمانوں نے جلا دیا تھا۔ ثابت یہ کرنا تھا کہ مسلمان اور ان کا خلیفہ دونوں علم کے دشمن اور جہل کے ہم نوا تھے۔

جرجی زیدان مصری ایک مشہور عیسائی عالم اور مؤرخ گزرا ہے۔ اس نے اپنی کتاب 'تاریخ التمدن الاسلامی' میں مستشرقین کے اس الزام کو نئے دلائل سے آراستہ کر کے پیش کیا ہے۔ علامہ شبلی نعمانیؒ نے اس دروغ گوئی کا مدلّل جواب ایک رسالہ لکھ کر دیا، جس کا نام 'الانتقاد علی التمدن الاسلامی' ہے۔

لیکن مستشرقین کی اس علمی شرارت کے اثرات آج تک کام کر رہے ہیں اور بہت سے بے خبر اہلِ علم اب بھی وقفہ وقفہ سے یہ الزام دہراتے رہتے ہیں کہ اسکندریہ کی لائبریری مسلمانوں نے جلائی تھی۔ ابھی حال ہی میں ہندوستان کے ایک مقتدر سائنسی ادارہ انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی دہلی کے مؤقر جریدہ 'انڈین جرنل آف ہسٹری آف سائنس' میں ایک مضمون بعنوان: The Tragedy that the Library at Alexandria was finally burned by the Islamic Arabs in 638 AD during the Reign of the Second Caliph Hazrat Omar (581-644 AD) شائع ہوا ہے۔ اس عنوان کے تحت مضمون نگار نے کسی حوالے کے بغیر لکھا ہے:

> "Omar is reported to have said: if the writings of the Greeks agree with the Quran, they are useless and need not be preserved; if they disagree, they are pernicious and ought to be destroyed."[6]

> ''بیان کیا جاتا ہے کہ (حضرت) عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: اگر یونانیوں کی تحریریں قرآن کے موافق ہیں تو وہ از کار رفتہ ہیں اور اگر ناموافق ہیں تو پھر یہ مضر ہیں اور ان کو تباہ و برباد کر دینا چاہیے۔''

اس مضمون نگار کا نام ڈاکٹر سسری مجمدار ہے اور وہ لندن میں مقیم ہے۔ اوپر کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ یہ شخص مستشرقین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمی کا شکار ہے اور اس کا مطالعہ ناقص اور ذہن مذہبی تعصب سے آلودہ ہے۔

---

۶؎ انڈین جرنل آف ہسٹری آف سائنس، انڈین نیشنل سائنس اکیڈمی نئی دہلی، جلد نمبر ۱۴، شمارہ نمبر ۳، ماہ ستمبر ۲۰۰۶ء



www.al-mawrid.org www.javedahmadghamidi.com

اسے نہیں معلوم کہ اسکندریہ لائبریری کو مسلمانوں نے نہیں، عیسائی مذہبی جنونیوں (fanatics) نے ۳۹۱ء میں جلا کر خاک کر دیا تھا۔ مشہور مؤرخ گبن نے اپنی کتاب 'The Decline and Fall of the Roman Empire' میں دلائل کے ساتھ اس تاریخی حقیقت کا ذکر کیا ہے۔

## عہدِ حاضر میں مغرب کی اسلام دشمنی

اس تفصیل سے ہمارا مقصود یہ دکھانا تھا کہ موجودہ دور میں اسلام کی مخالفت کوئی نیا واقعہ نہیں ہے، یہ تاریخی تسلسل رکھتا ہے۔ سموئیل ہن ٹنگٹن نے اپنی کتاب 'تہذیبوں کے ٹکراؤ' (Clash of Civilizations) میں لکھا ہے کہ مغرب کے لیے اصل مسئلہ اسلامی بنیاد پرستی (IslamicFundamentalism) نہیں بلکہ اسلام ہے، جو اپنی ایک الگ تہذیب رکھتا ہے اور وہ تہذیب مغربی سے بالکل مختلف بلکہ متصادم ہے۔ اس تہذیب کے پیرو یہ پختہ یقین رکھتے ہیں کہ اسلامی تہذیب دوسری تمام تہذیبوں سے برتر ہے، ان پر فوقیت رکھتی ہے۔ لیکن اس شدید احساس سے بھی دوچار ہیں کہ وہ مغرب کے مقابلے میں بہت کمزور قوت رکھتے ہیں[۷]۔ اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ مستقبل میں اسلام مغرب کا اسی طرح حریف ہوگا جس طرح کبھی کمیونزم تھا بلکہ اس سے زیادہ خطرناک حریف ثابت ہوگا۔

ہالینڈ کی پارلیمنٹ کے ایک ممبر جیرٹ وایلڈرس نے اسلام اور قرآن کے خلاف ایک فلم بنائی ہے اور اب وہ انٹرنیٹ پر دکھائی جا رہی ہے۔ اس بد باطن عیسائی سے جب پوچھا گیا کہ اس نے یہ فلم کیوں بنائی ہے تو اس نے کہا:

"Islam and Quran are part of fascist idealogy that wants to kill every thing we stand for in modern western democracy."[۸]

''اسلام اور قرآن دونوں ایک فاشسٹ نظریہ کے حصّے ہیں اور وہ ہر اس چیز کو تباہ و برباد کر دینا چاہتے ہیں جس کو ہم جدید مغربی جمہوریت میں عزیز رکھتے ہیں اور اس کے علم بردار ہیں۔''

اسلام کے بارے میں ہن ٹنگٹن اور وائلڈرس کے مذکورہ معاندانہ خیالات ماضی کی صدائے بازگشت نہیں تو کیا ہے۔

---

۷۔ کالیش آف سویلائزیشن (Clash of Civilizations)، ہن ٹنگٹن، ۱۹۹۶ء، ص ۲۱۷

۸۔ سنڈے ٹائمز لندن، بحوالہ دی ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی، (ٹائمز گلوبل)، ۲۴ مارچ ۲۰۰۸ء، ص ۲۲

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

ہم لکھ چکے ہیں کہ اسلام کی مخالفت میں عیسائیوں کا مذہبی طبقہ ہمیشہ پیش پیش رہا ہے اور آج بھی یہ صورت برقرار ہے۔ ابھی حال میں عیسائیوں کے روحانی پیشوا پوپ بینیڈکٹ نے جرمنی کی ایک یونیورسٹی جینس برگ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ اسلام جنگ اور جہاد کا حامی ہے اور دنیا میں مذہبی انتہا پسندی کو فروغ دے رہا ہے۔

انھوں نے اپنے اس الزام کی تائید میں چودھویں صدی کے بازنطینی بادشاہ مینول دوم (Emmanuel II) کا درج ذیل قول نقل کیا:

> "Show me just that Mohammad brought that was new, and there you will find things only evil and inhuman, such as his command to spread by the sword the faith he preached" [۹]

> ''مجھے دکھاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کیا نئی چیز پیش کی ہے۔ اس میں تم برائی اور انسانیت کے خلاف باتوں کے علاوہ اور کچھ نہیں پاؤ گے، مثلاً تلوار کے ذریعے اسلامی عقیدے کو پھیلانے کا ان کا حکم۔''

پوپ کی یہ تقریر جو جہل و بے خبری اور مذہبی تعصّب کی غماز ہے، اس گندی ذہنیت کو آشکارا کرتی ہے جس میں ان سے پہلے کے عیسائی مذہبی رہنما مبتلا رہ چکے ہیں۔ اس تقریر کے ذریعے انھوں نے عیسائی دنیا کو اسلام کے خلاف صف آرا ہونے کی دعوت دی ہے اور انسانیت کے قاتل جارج بش کی اسلام مخالف فکر کی ہم نوائی کی ہے۔

موجودہ دور میں جب کہ مسلمان دنیا کے ہر خطے میں سیاسی اور تہذیبی اعتبار سے مکمل طور پر مغلوب اور شدید نوعیت کے مذہبی اختلافات میں مبتلا ہیں، مغرب کی طرف سے اسلام کی مخالفت بظاہر عجیب لگتی ہے۔ اس مخالفت کے کئی اسباب کی نشاندہی کی گئی ہے، مثلاً یہ کہ وہ مسلمانوں کی مذہبی بیداری (religious revivalism) سے خائف ہے اور اسلامی تہذیب کو اسی طرح مغربی تہذیب اور جمہوری اقدار کا حریف سمجھتا ہے جس طرح کبھی کمیونزم اس کا مدِّ مقابل تھا۔ لیکن راقم کو اس خیال سے اتفاق نہیں ہے اور اس کو مسلمانوں کی خوش گمانی خیال کرتا ہے۔ ہم جس چیز کو مسلمانوں کی مذہبی بیداری سمجھتے ہیں وہ دراصل مذہبی بیداری نہیں ہے بلکہ اسلام کے نام سے سیاسی ہنگامہ آرائی اور بے روح ظاہری مذہبیت کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ صحیح مذہبی بیداری ذہنی اور اخلاقی بیداری سے عبارت ہے اور اس میدان میں مسلمان ایک عرصۂ دراز سے محوِ خواب ہیں، اور یہی ان کے قومی زوال کی اصل وجہ ہے۔

---

۹ دی سنڈے ٹائمز آف انڈیا نئی دہلی، ۱۴ر ستمبر ۲۰۰۶ ص ۲۹

رہی اسلام کی تہذیبی برتری تو وہ نظری اعتبار سے ایک حقیقت ہے۔لیکن عملاً اس کا بھی کہیں وجود نہیں ہے۔ اکثر مسلم ممالک میں مغربی تہذیب حاوی ہے، ہماری زبانیں، ہمارے لباس اور ہمارے طرز معاشرت سب پر مغربی تہذیب کے اثرات بالکل نمایاں ہیں۔ جدید علوم وفنون کے میدان میں ہم دنیا کی بیشتر زندہ اقوام سے پیچھے ہیں۔ جمہوری طرز حکومت سے مسلمانوں کو ازلی بیر ہے۔اکثر مسلم ملکوں میں مطلق العنان بادشاہی یا ڈکٹیٹر شپ قائم ہے۔ حد تو یہ ہے کہ ہمارے دینی مدارس، مذہبی جماعتوں اور خانقاہوں تک میں جمہوریت ناپید ہے۔

میری نظر میں مغرب کے موجودہ اسلام مخالف رجحان کے دو بنیادی اسباب ہیں۔ایک سبب یہ خیال ہے کہ اسلام جمہوری قدروں بالخصوص سیکولرزم کا مخالف ہے۔اور مذہبی حکومت کا مطلب مطلق العنانی اور ماضی کی پاپائیت (papacy) ہے۔اس خیال کو ایران کے اسلامی شیعی انقلاب اور افغانستان میں طالبان کی مذہبی حکومت کی تنگ نظری اور مذہبی سخت گیری نے تقویت پہنچائی ہے۔ اس ریڈیکل اسلام کو اہلِ مغرب یورپی تہذیب کا اسی طرح حریف سمجھتے ہیں جس طرح کبھی کمیونزم کو اس کا بدترین دشمن سمجھتے تھے۔

یہ بات صحیح ہے کہ اسلام سیکولرزم کے مغربی تصور کا مخالف ہے کیوں کہ اسلامی ریاست کی بنیاد خدا پرستی کے تصور پر قائم ہے، لیکن وہ جمہوری قدروں کا مخالف نہیں بلکہ اس کا حامی ہے۔اس کا تاریخی ثبوت فاروقی خلافت ہے۔لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اسلام کا شورائی یا جمہوری نظام بہت جلد ملوکیت میں تبدیل ہو گیا۔ بدقسمتی سے آج تک یہ نظام دنیا میں کہیں قائم نہیں ہوسکا اور نہ مستقبل میں اس کا کوئی امکان نظر آتا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

آج کل بہت سے مسلم ملکوں میں مختلف دینی جماعتیں جس طرح کے اسلامی نظام کے قیام کی داعی ہیں اور جس اسلامی شریعت کے نفاذ کی باتیں کرتی ہیں اس نے بھی مغربی ذہنوں کو غلط فہمی میں مبتلا کیا ہے۔جس چیز کو آج اسلامی شریعت کہا جاتا ہے اس سے مراد وہ شریعت نہیں جو خدا کی کتاب میں بنیادی اصولوں کی شکل میں موجود ہے، بلکہ قیاسی احکام کا وہ مجموعہ مراد ہے جو قرآن کے بعض اصولوں کی روشنی میں ہزار سال سے پہلے عہدِ عباسی یا اس کے قریب کے زمانے میں اس عہد کے مخصوص حالات میں وضع کیا گیا تھا۔ظاہر ہے کہ اس طرح کے جامد مذہبی احکام کے تحت قائم ہونے والی حکومت ماضی میں روم کے پوپ پادریوں کی متشدّد حکومت سے کچھ مختلف نہیں ہوگی۔ افغانستان میں طالبانی حکومت کی صورت میں اس کا بدترین نمونہ ہم دیکھ چکے ہیں۔آخر کیا وجہ ہے کہ خدا نے اس مذہبی حکومت کو قائم نہیں رہنے دیا، کیا وہ یہ چاہے گا کہ زمین میں اس کے حکم وقانون کی بالادستی قائم نہ ہو؟

قرآن میں جس نظام زندگی کا ذکر ہوا ہے اس کی صورت اس سے بالکل مختلف ہے۔ یہ ایک ایسا متحرک نظام

حیات ہے جس کا مقصد زندگی کے ہر شعبہ میں عدل وقسط کا قیام ہے۔ فرمایا گیا ہے:

یَا دَاوُدُ اِنَّا جَعَلْنٰکَ خَلِیْفَةً فِی الْاَرْضِ فَاحْکُمْ بَیْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْھَوٰی. (سورہ ص: ۲۶)

''اے داؤد، ہم نے تمھیں زمین میں خلیفہ (حکم راں) بنایا ہے پس تم لوگوں کے درمیان حق وانصاف سے حکومت کرو اور خواہش نفس کی پیروی نہ کرو۔''

اس نظام میں وحدتِ الٰہ (Unity of God) اور وحدتِ آدمیّت (unity of mankind) کے تصورات کو اساسی حیثیت حاصل ہے۔ یہ امتیاز صرف مذہب اسلام کو حاصل ہے کہ اس کے تمام کلی قوانین (fundamental laws) عقل اور فطرت سے کامل ہم آہنگی رکھتے ہیں اور اس کے جزئی احکام میں لوگوں کے لیے بڑی سہولت اور نرمی ہے اور عفو و درگذر کا پہلو غالب ہے۔ یہ اس خدائے رحیم کا قانون ہے جو اپنے بندوں کی خطاؤں کے باوجود ان کو سزا دینے میں تاخیر سے کام لیتا ہے اور ان کو کھلاتا اور پلاتا ہے۔ کم عقل مذہبی لوگوں نے خدائی شریعت کے اس مزاج کو نظر انداز کیا ہے۔ انھوں نے اسلامی شریعت کے تعزیری قوانین (penal codes) کو یک لخت اور کسی تفریق کے بغیر ہر طرح کے خطا کاروں پر نافذ کرنے کی وکالت کر کے ان کی غلط تعبیر پیش کی ہے، جس نے بہت سے لوگوں کے ذہنوں میں خوف و ہراس پیدا کر دیا ہے۔ اسلامی سزاؤں کی اسی غلط تشریح و تعبیر کی وجہ سے مغرب کے اربابِ علم نے ان کو وحشیانہ سزا قرار دے کر رد کر دیا ہے۔ افسوس کہ انھیں یہ نہیں بتایا گیا کہ یہ سخت سزائیں صرف عادی مجرموں (habitual criminals)، ظالموں (tyrants) اور فسادی لوگوں کے لیے ہیں۔ قرآن میں سنگین جرائم کے ارتکاب کے لیے 'فساد فی الارض' کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے۔ فرمایا گیا ہے:

''اِنَّمَا جَزٰٓؤُا الَّذِیْنَ یُحَارِبُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ وَیَسْعَوْنَ فِی الْاَرْضِ فَسَادًا اَنْ یُّقَتَّلُوْٓا اَوْ یُصَلَّبُوْٓا اَوْ تُقَطَّعَ اَیْدِیْھِمْ وَاَرْجُلُھُمْ مِّنْ خِلَافٍ اَوْ یُنْفَوْا مِنَ الْاَرْضِ ذٰلِکَ لَھُمْ خِزْیٌ فِی الدُّنْیَا وَلَھُمْ فِی الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِیْمٌ. اِلَّا الَّذِیْنَ تَابُوْا مِنْ قَبْلِ اَنْ تَقْدِرُوْا عَلَیْھِمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ.

''جو لوگ خدا اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرنے میں سرگرم رہتے ہیں، ان کی سزا یہی ہے کہ ان کو قتل کیا جائے، یا ان کو سولی دی جائے، یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹ دیے جائیں، یا ملک بدر کر دیے جائیں۔ یہ ان کے لیے زیادہ بڑی سزا ہے۔ ہاں اگر اس سے پہلے کہ تم انھیں مغلوب کر لو وہ (ظلم وفساد سے) توبہ کر لیں (تو

(سورہ مائدہ:۳۳، ۳۴) ان کے لیے معافی ہے)، جان لو کہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔‘‘

قرآن کی یہ آیات اسلام کے تعزیری قوانین کی روح و غایت کو واضح کر دیتی ہیں۔ دیکھیں، ظالموں اور جنگ بازوں کے لیے جو سزائیں تجویز کی گئی ہیں ان میں کڑی اور ہلکی دونوں سزائیں ہیں، کیوں کہ ظلم وفساد کے بھی درجے ہیں۔ سب ظالموں کے لیے ایک ہی سزا انصاف کے خلاف ہوگی۔ سب سے ہلکی سزا ملک بدری ہے (او ینفوا من الارض)۔ ان سخت سزاؤں کے بیان کے بعد کہا گیا ہے کہ اگر یہ ظالم اور فسادی لوگ اسلامی حکومت کے حکام کے ذریعے گرفتار ہو جانے سے پہلے ظلم وفساد سے توبہ کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم معاف کر دیے جائیں گے۔ پھر فرمایا کہ اللہ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ مغرب کے اصحابِ دانش سزاؤں کو وحشیانہ کہتے ہیں، بتائیں کہ کیا دنیا کے کسی تعزیری قانون میں جرائم سے توبہ کرنے کی صورت میں عفوو بخشش کی گنجائش ہے؟

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

مغرب کی طرف سے اسلام کی مخالفت کی دوسری وجہ خالص مذہبی ہے۔ قرآن واحد مذہبی کتاب ہے جس میں دوسرے مذاہب کے عقاید واعمال کا نہ صرف اجمالاً ذکر ہوا ہے بلکہ ان پر تنقید بھی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ غلط عقاید واعمال ہر قوم کے مذہبی پیشواؤں نے خدا کی کتابوں میں تحریف کر کے اختراع کر لیے ہیں، اصل خدائی دین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ دوسرے مذاہب پر قرآن کی تنقید اور ان کی اصلاح کی وجہ یہ ہے کہ یہ آخری صحیفۂ ہدایت ہے، اس کے بعد نہ کوئی کتاب آنے والی ہے اور نہ کوئی رسول۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے اس کتاب کو ضائع ہونے سے بچایا اور آج قرآن واحد مذہبی کتاب ہے جو اسی شکل میں کامل طور پر محفوظ ہے جس شکل میں وہ چودہ سو سال پہلے نازل ہوا تھا۔

مذاہب عالم پر قرآن کی اسی شدید تنقید کی وجہ سے ہر دور میں اسلام کی مخالفت کی گئی ہے۔ موجودہ دور میں بھی اس کی مخالفت کی یہ ایک بڑی وجہ ہے۔ مختلف مذاہب بالخصوص یہود ونصاری کے مذہبی پیشوا اور ان کی حکومتیں یہ نہیں چاہتی ہیں کہ ان کے ہم مذہب قرآن کی تعلیمات سے واقف ہوں اور اس میں ان کے جن مذہبی نقائص کو اجاگر کیا گیا ہے ان سے آگاہ ہوں۔ یہ ٹھیک اسی طرح کی مخالفت ہے جو عہدِ نبوت میں مشرکین عرب کی طرف سے ہوئی تھی۔ قرآن میں ہے:

وَقَالَ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا لَا تَسۡمَعُوۡا لِهٰذَا الۡقُرۡاٰنِ وَالۡغَوۡا فِيۡهِ لَعَلَّكُمۡ تَغۡلِبُوۡنَ. (سورہ حٰمٓ سجدہ:٢٦)

''کافر کہتے ہیں کہ اس قرآن پر کان نہ دھرو اور (جب وہ سنایا جائے تو درمیان میں) شوروغل کروتا کہ (لوگ اسے سن نہ سکیں اور اس طرح) تم غالب رہو۔''

اس وقت اہلِ مغرب قرآن کی آواز کو دبانے کے لیے علمی اور غیر علمی ہر طرح کا شوروغل کرنے میں ہمہ تن مصروف ہیں۔ معلوم ہے کہ یورپ کے بیشتر ملکوں اور امریکہ میں جمہوری نظام قائم ہے۔ اس نظام میں ہر شخص کو اظہارِ خیال اور اپنی پسند کا عقیدہ و مذہب رکھنے کی مکمل آزادی حاصل ہے۔ اس میں یہ آزادی بھی دی گئی ہے کہ کوئی کسی بھی مذہب کو نہ مانے اور ملحد و بے دین بن کر زندگی گزارے۔ چنانچہ ان ملکوں میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی ہے جو مذہب کے منکر ہیں۔

اس انکارِ مذہب کی دو بڑی وجہیں ہیں۔ ایک وجہ عیسائیوں کے مذہبی طبقہ کا وہ ظلم وستم ہے جو انھوں نے نشأۃ ثانیہ (Renaissance) کے زمانے میں اہلِ علم و تحقیق کے ساتھ روا رکھا۔ دوسری وجہ عیسائی مذہب کی غیر فطری اور غیر عقلی تعلیمات ہیں۔ مثلاً یہ بات کہ اگر کوئی تمھارے ایک گال پر طمانچہ مارے تو دوسرا گال بھی پیش کر دو۔ اسی طرح انجیل میں طلاق کی ممانعت ہے۔ سب سے بڑھ کر عقیدۂ تثلیث (concept of trinity) ہے جو بالکل غیر عقلی ہے، یعنی خدا تین بھی ہو اور ایک بھی۔ واقعۂ صلیب بھی بے اطمینانی کا سبب ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے کہ بیٹے کو انتہائی ذلت وخواری کے ساتھ صلیب پر چڑھا دیا جائے اور باپ (خدا) اس کو بچانے سے قاصر ہو، وغیرہ۔

قرآن میں عیسائیوں کے مذہب کی ان تمام غیر فطری اور غیر عقلی باتوں کو مضبوط دلائل کے ساتھ رد کیا گیا ہے۔ جو شخص بھی سچائی کی تلاش میں مذہبی تعصب سے بلند ہو کر اس کتاب کو پڑھے گا وہ اس کو تسلیم کرے گا اور اس پر ایمان لائے گا۔ اور یہی وہ بات ہے جس کے اندیشہ سے اس وقت یورپ مضطرب ہے۔ اس کو یہ فکر دامن گیر ہے کہ کہیں عیسائی بالخصوص ان کے اصحابِ علم مسیحی مذہب سے غیر مطمئن ہونے کی وجہ سے اسلام کی طرف مائل نہ ہو جائیں، جس کے آثار بالکل نمایاں ہیں۔ بکثرت عیسائی حلقہ بگوشِ اسلام ہو رہے ہیں۔ اسلام کی اس متوقع پیش قدمی کو روکنے کے لیے کٹر مذہبی عیسائی (Evangelist) اور اربابِ حکومت اس کوشش میں لگ گئے ہیں کہ اسلام اور قرآن کو بدنام کیا جائے۔ اس فطری اور عقلی مذہب کو دہشت گردی کا مذہب قرار دے کر مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت کی ایک ایسی دیوار کھڑی کر دی جائے کہ اسلام کا اصلی چہرہ دکھائی نہ دے، ان کو صرف مسلمانوں کا چہرہ دکھائی دے جو اس وقت بدقسمتی سے مذہبی انتہا پسندی (religious extremism) کی علامت بن چکا ہے۔

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

مسلمانوں اور عیسائیوں کے درمیان نفرت کا خوفناک ماحول بنانے کے لیے طرح طرح کی سازشیں ہو رہی ہیں جن میں یہودیوں کا فتنہ گر ذہن پوری طرح شریک ہے۔ 'نائن الیون' کا واقعہ (امریکہ کے عالمی تجارتی سنٹر پر حملہ) اس سازش کی ایک کڑی ہے۔ اس واقعہ کو بہانہ بنا کر بڑے پیمانے پر پروپیگنڈہ کیا گیا کہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور ان کی مذہبی کتاب (قرآن) ان کو دہشت گردی سکھاتی ہے۔ یہ لوگ فسطائی ذہنیت رکھتے ہیں اور دنیا سے ہر اس مذہب اور ہر اس تہذیب کو ختم کر دینا چاہتے ہیں جو ان کے مذہب اور ان کی تہذیب سے جداگانہ ہو، جیسا کہ ہن ٹنگٹن نے لکھا ہے اور ہم اس کا ذکر کر چکے ہیں۔

اہلِ مغرب جان بوجھ کر وقفہ وقفہ سے کبھی قرآن کی توہین کرتے ہیں اور کبھی پیغمبرِ اسلام کی تذلیل کے حیلے بہانے ڈھونڈتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ مسلمان طبعاً جذباتی اور مشتعل مزاج واقع ہوئے ہیں، اس لیے اہانتِ رسول اور تحقیرِ قرآن کے واقعات پر وہ یقیناً پُر تشدد احتجاج کریں گے اور اس طرح وہ اہلِ جہاں کو دکھا سکیں گے کہ مغرب کی طرف سے جو الزام اسلام اور اس کے پیروؤں پر لگایا جاتا ہے وہ صداقت رکھتا ہے۔ اس لیے جو قومیں حرّیتِ ضمیر اور اظہار رائے کی آزادی پر یقین رکھتی ہیں وہ متحد ہو کر اس فسطائی قوت کا مقابلہ کریں۔

افسوس کہ مغربی اقوام اور امریکہ کی اس سازش کو ناکام بنانا تو کجا مسلمان اس کو غیر شعوری طور پر کامیابی سے ہم کنار کر رہے ہیں۔ اس طرح کہ جب وہ ہم کو اہانتِ رسول یا توہینِ قرآن کے کسی واقعے کے ذریعے سے اشتعال دلاتے ہیں تو ہم فوراً مشتعل ہو کر وہ کام کر جاتے ہیں جو ان کو مطلوب ہے، یعنی یہ دکھانا کہ مسلمانوں میں صبر و برداشت کی کمی ہے۔ وہ اظہار رائے کی آزادی کا جو عصر جدید کے انسانوں کا جمہوری حق ہے، احترام نہیں کرتے اور تشدد کا ہتھیار استعمال کر کے اپنے مخالفوں کو دبانا چاہتے ہیں۔

## معاندینِ اسلام کی اشتعال انگیزی کا جواب

اہلِ مغرب قرآن اور پیغمبر اسلام کے خلاف جو نازیبا حرکتیں کرتے ہیں ان کا ترکی بہ ترکی جواب تو یہ تھا کہ جس وقت وہ قرآن کے اوراق پھاڑیں یا اس کو بیت الخلا میں بہائیں تو مسلمان بھی ان کی مذہبی کتابوں کے ساتھ یہی سلوک کریں۔ اسی طرح جب وہ ان کے پیغبر کی اہانت کے مرتکب ہوں تو وہ بھی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کی اہانت کریں۔ آخر الذکر کی اہانت کا مواد یہودیوں نے جمع کر دیا ہے۔ اس صورت میں اہلِ مغرب کا

امتحان بھی ہو جاتا کہ وہ اظہارِ رائے کی آزادی پر کتنا یقین رکھتے ہیں اور ان میں کس قدر ضبط وتحمل ہے۔ راقم کو یقین ہے کہ یہ اس امتحان میں ناکام ہو جائیں گے۔ یہ دوغلے لوگ ہیں اور دہرا معیار رکھتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ کوئی مسلمان اظہارِ رائے کی آزادی کے نام پر بقیدِ ہوش وحواس کسی بھی نبی و رسول کی اہانت کی ہمت نہیں کرے گا۔ اہانتِ انبیاء تو بڑی چیز ہے اسلام تو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ مسلمان کسی قوم کے مذہبی پیشواؤں کی تذلیل کریں حتیٰ کہ انھیں بت پرستوں کے باطل معبودوں کی برائی کرنے سے بھی روک دیا گیا ہے (سورہ انعام:۱۰۸)

اب سوال یہ ہے کہ مسلمان کیا کریں، کیا وہ معاندینِ اسلام کی اشتعال انگیزی کے جواب میں خاموش ہو جائیں اور صبر کر کے بیٹھ رہیں۔ اس مسئلے کو قومی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں تو تسلیم کرنا ہوگا کہ قرآن اور رسول اُمی صلی اللہ علیہ وسلم کی تذلیل واہانت کے جواب میں سر بہ زانو ہو کر بیٹھ رہنے کی گنجائش نہیں ہے۔ وہ قوم یقیناً بے غیرت کہی جائے گی جو اس وقت بھی مہر بہ لب رہے جب اس کی مذہبی کتاب اور اس کے رسول کی علی الاعلان تحقیر وتوہین کی جا رہی ہو۔

لیکن خالص مذہبی اور قرآنی زاویۂ نگاہ سے مذکورہ سوال کا جواب اس سے مختلف ہوگا۔ مسلمان یہ بات نہ بھولیں کہ وہ دوسری قوموں کی طرح محض ایک قوم نہیں ہیں۔ وہ اس سے کچھ زیادہ حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ خیرِ امّت ہیں (سورہ آل عمران:۱۱۰) اس لیے غصہ اور رنج وتکلیف کے مواقع میں ان کا ردِّ عمل دوسری قوموں سے یقیناً مختلف ہونا چاہیے۔ قرآن میں مسلمانوں کو 'اُمّتِ وسط' کہا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

"وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا. (سورہ بقرہ:۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تمھیں ایک درمیان کی جماعت بنایا تاکہ تم لوگوں پر (اپنے عمل کے ذریعے میانہ روی کی) شہادت دینے والے بنو اور رسول تم پر گواہی دے (کہ اس نے اپنے قول وفعل سے تم کو اعتدال کی راہ دکھادی)''

اس آیت کی روشنی میں یہ سوال اٹھے گا کہ اسلام کے مخالفوں کے جواب میں مسلمانوں کا معتدل رویّہ کیا ہو؟ قرآن میں اس سوال کا جو جواب دیا گیا ہے وہ ملاحظہ ہو:

وَاِذَا خَاطَبَهُمُ الْجٰهِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا. (سورہ فرقان:۶۳)

''جب نا سمجھ لوگ ان سے (یعنی رحمان کے بندوں سے جہالت کی) بات کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں، سلام (اور آگے بڑھ جاتے ہیں)''

---

۱۰؎ عربی شعر کا ترجمہ راقم سطور نے کیا ہے۔



www.javedahmadghamidi.org www.al-mawrid.org

اس آیت کی تفسیر بیان کرتے ہوئے مولانا شبیر احمد عثمانی نے 'موضح فرقان' کے حاشیہ پر لکھا ہے:

''یعنی کم عقل اور بے ادب لوگوں کی بات کا جواب عفو و درگذر سے دیتے ہیں۔ جب کوئی جہالت کی گفتگو کرے تو ملائم بات اور صاحب سلامت کہہ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ ایسوں سے منہ نہیں لگتے۔ نہ ان میں شامل ہوں، نہ ان سے لڑیں۔ ان کا شیوہ وہ نہیں جو جاہلیت میں کسی شاعر نے کہا ہے:

اَلا لا یجھلن احدً علینافنجھلُ فوق جھلِ الجاھلینا.

''سن لو، ہم سے کوئی سخت کلامی نہ کرے ورنہ ہم جواب میں جاہلوں سے بڑھ کر جہالت کا مظاہرہ کریں گے۔''[10]

## صبر و اعراض

اس باب میں خود نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہمارے لیے بہترین نمونہ ہے۔ کون مسلمان نہیں جانتا کہ معاندین اسلام نے رسول خدا کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ انھوں نے آپ پر ہر طرح کے ظلم و ستم ڈھائے اور آپ کی تذلیل میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے دشمنوں کا مقابلہ جس ہتھیار سے کیا وہ صبر اور اعراض ہے۔ فرمایا گیا ہے:

وَاصۡبِرۡ عَلٰی مَا یَقُوۡلُوۡنَ وَاہۡجُرۡہُمۡ ہَجۡرًا جَمِیۡلًا. (سورۂ مزمل ۷۳: ۱۰)

''وہ جو کچھ (تکلیف دہ باتیں) کہتے ہیں ان کو برداشت کرو اور ان سے بھلے ڈھنگ سے اعراض کرو۔''

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے اس حکم پر مکمل طور سے عمل کیا۔ صبر اور اعراض کا معاملہ صرف مکہ ہی تک محدود نہیں رہا بلکہ جب مدینہ میں ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم ہوگئی تو بھی اسی ربّانی تعلیم پر عمل کیا گیا۔ ہم کو ایک مثال بھی ایسی نہیں ملتی جس میں اسلام کے مخالفوں کے خلاف تشدد کی راہ اختیار کی گئی ہو بلکہ ہر مخالف کا جواب صبر و تحمل سے دیا گیا۔ میں یہاں چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

(۱) مدینہ کے یہودی علانیہ اپنی مجلسوں میں قرآن اور رسول خدا کا مذاق اڑاتے لیکن اس کے جواب میں مسلمانوں سے یہ نہیں کہا گیا کہ وہ ان کے خلاف مظاہرہ کریں یا ان سے تشدد کے ساتھ پیش آئیں بلکہ یہ کہا گیا کہ جب ان کی مجلسوں میں اللہ کی آیات کا مذاق اڑایا جائے تو وہ وہاں اس وقت تک نہ بیٹھیں جب تک کہ موضوع گفتگو بدل نہ جائے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

اِذَا سَمِعْتُمْ اٰیٰتِ اللّٰہِ یُکْفَرُ بِھَا وَ یُسْتَھْزَاُ بِھَا فَلَا تَقْعُدُوْا مَعَھُمْ حَتّٰی یَخُوْضُوْا فِیْ حَدِیْثٍ غَیْرِہٖ. (سورۂ نسآء:۱۴۰)

''جب تم سنو کہ اللہ کی آیات کا انکار کیا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے تو ان کے ساتھ نہ بیٹھو یہاں تک کہ وہ کسی دوسری بات میں مشغول ہو جائیں۔''

(۲) یہودی منافق جب رسول اللہ کی مجلس میں آتے تو آپ کو ایسے الفاظ سے مخاطب کرتے جو ذو معنی ہوتے۔ مثلاً وہ کہتے: اِسْمَع غیر مسمع ''ذرا ہماری بات بھی سن لیں جو بڑی اہم ہے اور ابھی تک یہ بات نہیں کہی گئی ہے۔'' لیکن اس کے دوسرے معنی یہ بھی تھے کہ ''ہماری بات بھی سن لیں جو بڑی اہم ہے، یوں تم اس قابل نہیں کہ تمھیں یہ اہم بات سنائی جائے۔ اسی طرح وہ 'راعنا' کہتے جو ایک مجلسی فقرہ ہے اور عربوں کی مجلسی گفتگو میں مستعمل تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ ''ذرا ہماری طرف بھی توجہ ہو یا ہماری بھی رعایت کی جائے۔'' لیکن یہودی اس فقرے کو زبان مروڑ کر اس طرح ادا کرتے کہ 'راعینا' ہو جاتا، یعنی اے ہمارے چرواہے۔ (سورہ نسآء:۴۶)

وحی نے یہودیوں کی اس پوشیدہ گستاخی سے پردہ اٹھا دیا لیکن اُن کے خلاف کوئی انتقامی کارروائی نہیں کی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ وہ مذکورہ مجلسی الفاظ کے استعمال میں احتیاط کریں اور یہودیوں کے برخلاف رسول خدا کو مخاطب کرتے وقت 'راعنا' کی جگہ صرف 'انظرنا و اسمعوا' (بقرہ۔۱۰۴) کہیں یعنی ''ہماری طرف بھی توجہ فرمائیں، ہماری بھی سن لیں۔''

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

(۳) عبداللہ بن ابی بن سَلُول کے نام سے قارئین واقف ہوں گے۔ یہ شخص مدینہ کے منافقوں کا سردار اور ایک انصاری قبیلہ خزرج کا رئیس تھا۔ مدینہ میں رسول اللہ کی آمد سے پہلے انصار کے دونوں قبیلوں (اوس اور خزرج) نے اس کو اپنا بادشاہ بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ دونوں قبائل کی باہمی لڑائی کو ختم کیا جا سکے۔ لیکن رسول اللہ کی تشریف آوری نے اس کا کھیل بگاڑ دیا اور وہ بادشاہ نہ بن سکا۔ اس محرومی نے اس کے اندر رسول خدا اور اسلام کے خلاف بغض و عناد بھر دیا تھا۔ چنانچہ وہ کبھی علانیہ اور کبھی پوشیدہ طور پر معاندانہ کارروائیاں کرتا رہتا۔ لیکن رسول اللہ اس سے چشم پوشی کرتے۔

ایک بار نبی صلی اللہ علیہ وسلم کہیں سے گزر رہے تھے کہ ابن اُبی نے آپ سے سخت بدتمیزی کا برتاؤ کیا، جس سے آپ کو بہت تکلیف پہنچی۔ آپ نے سعد بن عبادہ سے اس بدکلامی کی شکایت کی تو انھوں نے کہا، اے اللہ کے رسول، اس کے ساتھ نرمی کا معاملہ کریں۔ آپ کے آنے سے پہلے اس کی تاج پوشی ہونے جا رہی تھی۔ وہ سمجھتا ہے کہ آپ

---

۱۱؎ سیرت ابن ہشا، ابن ہشام، طبع مصر، ج ۲، ص ۲۳۷، ۲۳۸

نے اس سے یہ بادشاہی چھین لی[۱۱]۔

اس رئیس المنافقین نے غزوۂ بنی المصطلق کے موقع پر انصار مدینہ اور مہاجرین مکہ کو باہم لڑانے کی کوشش کی۔ واقعہ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ اسلامی لشکر بنی المصطلق کو شکست دینے کے بعد ابھی دشمن ہی کے علاقہ میں ٹھہرا ہوا تھا کہ ایک انصاری (سنان بن وبرا الجہنی) اور ایک مہاجر (جہجاج بن مسعود) کے درمیان ایک کنویں سے پانی لینے پر تکرار ہوگئی اور پھر نوبت ہاتھا پائی تک پہنچ گئی۔ ایک نے انصار کو اور دوسرے نے مہاجرین کو مدد کے لیے پکارا۔ ابن اُبی کو جیسے ہی اس ہنگامہ کی خبر ملی اس نے اوس وخزرج کے لوگوں کو یہ کہہ کر بھڑکانا شروع کیا کہ ایک مہاجر کی یہ ہمت کہ اس نے ایک انصاری کی تذلیل کی۔ خدا کی قسم، یہ سب تمہارا کیا دھرا ہے۔ دوڑ واور اپنے ہم قبیلہ کی مدد کرو۔ کچھ مہاجر بھی باہر نکل آئے اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے یہ دوگروہ باہم لڑ پڑیں۔ جوں ہی نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی خبر ملی آپ فوراً اپنے خیمے سے نکلے اور معاملہ کو رفع دفع کیا۔

یہ صلح وصفائی دیکھ کر ابن اُبی اور اس کے ساتھیوں کو بہت غصہ آیا۔ اس نے کہا کہ اے انصار کے لوگو، ابھی وقت ہے۔ اگر تم لوگ مہاجر کنگالوں کی امداد واعانت سے ہاتھ کھینچ لو تو یہ تین تیرہ ہو جائیں۔ عہد کرو کہ مدینہ پہنچ کر ہم میں سے جو عزت والا ہے وہ ذلیل کو نکال باہر کرے گا۔ (سورہ منافقون: ۷، ۸)

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جب ابن اُبی کی اس دریدہ دہنی کا چرچا ہوا تو مہاجرین میں کافی اشتعال پیدا ہوا۔ حضرت عمر نے رسول اللہ سے فرمایا کہ مجھے اجازت دیں تو اس منافق کو قتل کر دوں۔ اور اگر آپ یہ کام مجھ سے نہ لینا چاہیں کہ وہ انصار کا آدمی ہے اور میں مہاجر ہوں تو کسی انصاری مسلمان، مثلاً معاذ بن جبل یا سعد بن معاذ وغیرہ کو بلا کر کہہ دیں وہ اس کو قتل کر دیں گے۔ آپ نے مشورہ قبول نہیں کیا[۱۲]۔

ان تمام واقعات سے جن کا اوپر ذکر ہوا، مسلمانوں کو یہ سبق ملتا ہے کہ وہ اسلام کے دشمنوں کے ساتھ عفوو درگذر کا معاملہ کریں اور ان کی ناشایستہ حرکات کے جواب میں حتی الامکان صبر واعراض کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔

## حمایتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا صحیح طریقہ

---

۱۲ ایضاً، ج۳، ص۱۵۰

بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ واقعہ مختلف سندوں سے نقل ہوا ہے۔

دشمنانِ اسلام اور اعدائے رسول کی یاوہ گوئیوں اور دشنام طرازیوں کے جواب میں صبر و اعراض کی مذکورہ اسلامی تعلیم کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان اپنے ہونٹ سی لیں اور کسی شکل میں بھی اپنے جذبات کا اظہار نہ کریں۔ صبر اور اعراض کی تعلیم تو اس لیے دی گئی ہے کہ گندگی کو گندگی سے دھونا غیر اخلاقی بات ہے اور اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر پوشیدہ ہے۔ گندگی کو پانی سے دھونے میں کوئی حرج نہیں اور اس کی اجازت دی گئی ہے۔

بلاشبہ ہر قوم کی طرح مسلمان بھی اپنے مذہب اور اپنے پیغمبر سے عقیدت و محبت رکھتے ہیں اور جب ان کی توہین کی جاتی ہے تو فطری طور پر ان کے جذبات مجروح ہوتے ہیں اور اس کا اظہار وہ ہنگامہ خیز جلوس اور جلسوں کی صورت میں کرتے ہیں اور اس سے اسلام اور مسلمانوں دونوں کو بہت نقصان پہنچتا ہے۔ اگر اعتدال کے اندر رہ کر پُر امن طریقے سے غم و غصہ کا اظہار کیا جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن قرآن نے ہم کو اس سے اچھا طریقہ بتایا ہے، جس سے کام لے کر ہم اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حمایت زیادہ بہتر طور پر کر سکتے ہیں۔

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

یہاں میں عہدِ نبوی کے اس واقعہ کا ذکر کروں گا جس کا تعلق زید بن ثابت کے واقعۂ طلاق سے ہے۔ عربوں میں قدیم سے دستور چلا آتا تھا کہ منہ بولا بیٹا حقیقی بیٹے کی طرح سمجھا جاتا تھا۔ وہ نہ صرف مال و جائداد کا صلبی بیٹے کی طرح وارث ہوتا تھا بلکہ اس کی بیوی سے بصورتِ طلاق و وفات اس شخص کا نکاح حرام تھا جو کسی کو منہ بولا بیٹا بناتا تھا۔ اللہ نے اس غیر ضروری دستور کو ختم کرنے کا فیصلہ کیا اور خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ جب زید بن ثابت جو آپ کے منہ بولے بیٹے تھے، اپنی بیوی زینب بنت جحش کو طلاق دے دیں تو وہ ان سے عقد کریں۔ کام آسان نہیں تھا لیکن آپ نے عواقب سے قطع نظر کر کے اللہ کے حکم کی تعمیل کی۔ اس شادی کا ہونا تھا کہ آپ کے خلاف ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا۔ اسلام اور رسولِ خدا کے دشمنوں کو اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کا ایک اچھا موقع مل گیا۔ چنانچہ انھوں نے منظّم طریقے سے پیغمبر اسلام کی کردار کشی کی مہم چلائی اور ہر طرح کا پروپیگنڈہ کیا۔

اس نازک وقت میں جب کہ پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کے جذبات بری طرح مجروح تھے، خدا کی طرف سے مسلمانوں سے کہا گیا کہ وہ اس اہانت کے جواب میں اپنے رسول کے حق میں دعائے رحمت کریں اور آپ پر کثرت سے درود و سلام بھیجیں۔ فرمایا:

اِنَّ اللّٰہَ وَ مَلٰٓئِکَتَہٗ یُصَلُّوْنَ عَلَی النَّبِیِ. یٰٓاَ یُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا صَلُّوْا عَلَیْہِ وَسَلِّمُوْا اِنَّ الَّذِیْنَ یُؤْذُوْنَ اللّٰہَ وَ رَسُوْلَہٗ لَعَنَھُمُ اللّٰہُ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ وَاَعَدَّ لَھُمْ عَذَاباً مُّھِیْناً.(سورہ احزاب ۳۳: ۵۶۔۵۷)

''اللہ اوراس کے فرشتے نبی پر رحمت بھیجتے ہیں، اے ایمان والو،تم بھی اس پر بکثرت درود وسلام بھیجو۔جولوگ اللہ اوراس کے رسول کو(اپنی نازیبا باتوں سے ) تکلیف پہنچاتے ہیں، اللہ نے دنیا اورآخرت دونوں میں ان کو اپنی رحمت سے محروم کر دیا ہے اوران کے لیے رسوا کن عذاب تیارکررکھا ہے۔''

نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے دعائے رحمت کا اتنا ہی مطلب نہیں کہ کچھ مخصوص الفاظ کے ذریعے انفرادی طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیج دیا جائے بلکہ اس کا مفہوم اس سے کچھ زیادہ ہے۔آیت کے موقعِ نزول کو سامنے رکھیں کہ اسلام کے دشمن ایک طرف نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر نفس پرستی کا گھناؤنا الزام لگا کر آپ کی کردار کشی کر رہے تھے اور دوسری طرف اسلام کی دعوت کو مشکوک بنانے کے درپے تھے۔اس لیے دشمنوں کے لیے مسکت جواب یہ ہوگا کہ جہاں انفرادی طور پر نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر درود وسلام بھیجا جائے وہاں آپ کے اعلیٰ اخلاق اور مثالی کردار کا بھی نمایاں طور پر اظہار واعلان ہو اوراس روحانی خیر وبرکت سے اقوام عالم کو آگاہ کیا جائے جو آخری رسول کی بعثت سے اہلِ جہاں کو پہنچا، بالخصوص وحدتِ الٰہ اور وحدتِ آدمیت کی آفاقی تعلیم جس سے آج بھی دنیا ٹھیک طور پر آگاہ نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے دور جدید کے تمام ذرائعِ نشر واشاعت کا استعمال ناگزیر ہے۔اخبارات ورسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن اس کام میں بہت زیادہ مددگار ثابت ہوں گے۔اس کے علاوہ ''سیرت النبی'' کے عنوان سے معیاری عالمی سیمینار اور مجالس مذاکرہ کا اہتمام بھی نتیجہ خیز ہوگا۔لیکن سب سے زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مسلمان اسلام کے سچے داعی بنیں۔ان کے قول وفعل دونوں سے اہلِ دنیا کو معلوم ہو کہ حقیقی اسلام یہ ہے اور یہ لوگ اس رسول کے ماننے والے ہیں جو خیرِ مجسم اور پیکرِ رحمت تھا۔(سورۃ الانبیآء ۲۱: ۱۰۷)

حقیقت یہ ہے کہ اسلام اوراس کے پیغمبر کی اہانت وہی شخص کرسکتا ہے جو تہذیب ومتانت سے معرّا، اخلاق باختہ،تعصب گزیدہ، دل کا اندھا اور حق ناآشنا ہوگا۔اسے نہیں معلوم کہ وہ چاند پر تھوکنے اور سورج پر خاک ڈالنے کی حماقت میں مبتلا ہے۔فی الحقیقت اس طرح کے نادان لوگ ہماری ہم دردی اور دل سوزی کے مستحق ہیں۔ان کے ساتھ مسلمان وہ معاملہ کریں جو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے شہر طائف کے ستم گروں کے ساتھ کیا تھا۔

معلوم ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے طائف کی گلیوں میں ناقابلِ بیان ظلم وستم کا سامنا کرنے اور اہانت کے بھاری پتھر کھانے کے باوجود ظالموں کے حق میں بد دعا نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ اے اللہ، یہ نادان ہیں، یہ نہیں جانتے ،تو

انھیں ہدایت دے۔ ہم مسلمان بھی دعا کریں کہ: اے رحیم و کریم خداے دو جہاں، سارے انسانوں کے خالق اور معبود حقیقی، تو اہلِ مغرب کے کور چشموں اور دل کے اندھوں کو بینائی دے، انھیں حق گوئی، عدل پروری اور تمیز خیر و شر کی توفیق عطا کر، انھیں حق و راستی دکھا تا کہ وہ قرآن اور محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی اہانت کے جرم میں روزِ آخرت خداے ذوالجلال کی دردناک سزا سے دوچار نہ ہوں کہ اس دن کوئی کسی کے کچھ کام نہ آئے گا:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ. ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ. يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ. (سورۂ انفطار ۸۲: ۱۷-۱۹)

”تم کیا جانو کہ روزِ جزا کیا ہے، ہاں تم کیا جانو کہ روزِ جزا کیا ہے، (سن لو کہ) اس دن کوئی شخص کسی کے کچھ کام نہ آئے گا اور فیصلہ اللہ کے اختیار میں ہو گا۔“

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

## سیرت صحابہ

محمد وسیم اختر مفتی

# عثمان غنی رضی اللہ عنہ

گذشتہ سے پیوستہ

(۴)

[''سیر وسوانح'' کے زیر عنوان شائع ہونے والے مضامین ان کے فاضل مصنفین کی اپنی تحقیق پر مبنی ہوتے ہیں، ان سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

۳۲ھ میں عبداللہ بن عامر، قیس بن ہیثم کو خراسان کا والی مقرر کر کے واپس ہوئے تو قارن ۴۰ ہزار کی فوج جمع کر کے طبسین سے خراسان روانہ ہوا۔ قیس نے عبداللہ بن خازم سے مشورہ کیا تو انھوں نے کہا میں یہاں رہ کر انھیں جنگ میں الجھاتا ہوں، آپ ابن عامر کے پاس جا کر کمک لے آئیں۔ قیس نے ۴ ہزار کی نفری تیار کی۔ کوچ سے پہلے انھوں نے ہدایت جاری کی ہر شخص اپنے نیزے سے روئی یا کپڑے کا ٹکڑا باندھ لے اور اسے گھی یا زیتون کے تیل سے تر کر لے۔ رات ہوئی تو انھوں نے ان فلیتوں (فتیلوں) کو آگ سے روشن کرنے کا حکم دیا۔ نصف شب کے قریب اس لشکر نے قارن کی سوئی ہوئی فوج پر دھاوا بول دیا۔ نیند میں مست فوجی ہڑبڑا کر اٹھے تو انھیں اوپر نیچے، آگے پیچھے ہر طرف آگ حرکت کرتی نظر آئی جس سے وہ خوف زدہ ہو گئے۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمان سپاہ نے قارن اور اس کے بہت سے فوجی قتل کر دیے اور بے شمار کو قید کر لیا گیا۔ گورنر ابن عامر نے اس فتح سے خوش ہو کر ابن خازم کو خراسان کا والی بنا دیا۔

۳۳ھ میں کوفہ کے ایک گروہ نے خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان، گورنر سعید بن عاص اور قبیلۂ قریش کو علانیہ برا بھلا کہنا شروع کیا۔ کمیل بن زیاد، اشتر نخعی (مالک بن یزید)، ثابت بن قیس، علقمہ بن قیس، جندب بن زہیر، جندب بن کعب، صعصہ بن صوحان، عروہ بن جعد اور عمرو بن حمق اس میں شامل تھے۔ حضرت سعید نے ان کی خبر حضرت عثمان کو کی تو انھوں نے انھیں حضرت معاویہ کے پاس شام بھیجنے کا حکم دیا۔ حضرت معاویہ نے ان کو تقویٰ کی روش اپنانے کی تلقین کی اور تفرقہ ڈالنے سے منع کیا لیکن وہ ان پر پل پڑے اور ان کی ڈاڑھی اور بال نوچ لیے۔ فتنہ گروں نے حضرت عثمان سے درخواست کی، انھیں کوفہ واپس بھیج دیا جائے۔ واپس آ کر انھوں نے اپنی فتنہ انگیزی جاری رکھی تو امیر المومنین نے حمص بھجوا دیا۔ وہاں کے گورنر خالد بن ولید کے بیٹے عبدالرحمان کے ڈرانے دھمکانے پر انھوں نے اپنی حرکتوں سے باز آنے کا وعدہ کیا۔ انھی کے کہنے پر اشتر مدینہ گیا اور اپنے پورے گروہ کی جانب سے حضرت عثمان سے معافی مانگی۔ وہ واپس پہنچا تو عبدالرحمان نے انھیں ساحل سمندر پر لا بسایا اور ان کی روزی مقرر کر دی۔ اسی سال ایسے ہی ایک گروپ کو بصرہ سے شام اور مصر بھیجا گیا۔

حُکیم بن جبلہ بصرہ کا لٹیرا تھا جو بھیس بدل کر لوگوں کو لوٹتا۔ اس کی شکایت حضرت عثمان کو پہنچی تو انھوں نے اسے جیل میں ڈالنے کا حکم دیا۔ اہل کتاب میں سے ایک شخص ابن سودا (عبداللہ بن سبا) کی سرگرمیاں بھی مشکوک تھیں، گورنر بصرہ عبداللہ بن عامر نے اسے کوفہ سے نکلوا دیا۔ ایسا ہی ایک کردار حمران بن ابان تھا، اس نے ایک عورت سے اس کی عدت گزرنے سے پہلے عقد کر لیا تو حضرت عثمان نے فسخ نکاح کے ساتھ اسے سزا دی اور بصرہ بھجوا دیا۔ یہاں وہ ابن عامر کی صحبت میں رہنے لگا لیکن جب لایعنی بحثوں میں الجھنے لگا تو انھوں نے اسے شام روانہ کیا۔ کوفہ سے نکالے ہوئے لوگ شام پہنچے تو حضرت معاویہ نے انھیں ایک حویلی میں ٹھہرایا اور کہا تم سب حماقت کا شکار ہوئے ہو۔ صعصعہ! تو سب سے بڑا احمق ہے۔ تم جو چاہو کرتے رہو لیکن اللہ کے احکام سے منہ نہ موڑو، امت سے چپکے رہو گے تو کامیاب ہو جاؤ گے۔ ان کے کہنے کا اتنا اثر ہوا کہ وہ نمازوں میں حاضر ہونے لگے۔

۳۴ھ میں عمال کے اتنے تبادلے ہوئے کہ کوفہ میں کوئی بڑا لیڈر نہ رہا، ان حالات میں فتنہ گروں کو ابھرنے کا موقع مل گیا۔ عامر بن عبداللہ تمیمی نے سیدنا عثمان سے ملاقات کی اور تمام گورنروں کو معزول کرنے کا مطالبہ کیا تو انھوں نے مشاورت کے لیے گورنروں کو طلب کیا۔ عبداللہ بن عامر نے مشورہ دیا لوگوں کو جہاد میں مشغول

رکھیں اس طرح کی سرگرمیوں سے باز آ جائیں گے۔ سعید بن عاص نے کہا فتنہ گروں کے لیڈروں کو ختم کر دیا جائے تو یہ خود ہی ختم ہو جائیں گے۔ حضرت معاویہ نے کہا گورنروں اور کمانڈروں پر ذمہ داری ڈالیں کہ ان سے نمٹیں۔ ابن ابی سرح کا مشورہ تھا انھیں مال و دولت سے نوازا جائے تو یہ راضی ہو جائیں گے۔ عمرو بن عاص بھی موجود تھے انھوں نے سخت لہجے میں کہا جو بات عوام کو پسند نہ ہو، اس میں اعتدال سے کام لینا چاہیے اور جب فیصلہ ہو جائے تو اس پر پختگی سے کاربند رہنا چاہیے۔ حضرت عثمان نے ان تمام مشوروں کو تسلیم کر کے ان پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے عطیات تقسیم کیے اور سرحدوں پر فوج جمع کرنے کا حکم دیا۔ کوفہ میں یزید بن قیس گورنر سعید بن عاص کو ہٹانے کی مہم شروع کر چکا تھا اس لیے وہاں کے باشندگان نے ان کی قیادت میں لڑنے سے انکار کر دیا۔ مقامی کمانڈر قعقاع نے گرفت کی تو یزید نے کہا ہم حضرت سعید سے استعفا چاہتے ہیں۔ اس نے منادی کرائی جو حضرت سعید کو ہٹا کر ابوموسیٰ اشعری کو گورنر بنوانا چاہتا ہے مجھ سے مل جائے پھر مختلف شہروں سے نکالے ہوئے اپنے ساتھیوں کو خط لکھے کہ وہ مصر میں جمع ہو جائیں۔ عمرو بن حریث نے فتنہ پردازوں کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن قعقاع کا خیال تھا تلوار ہی ان کا علاج ہے۔ اسی اثنا میں یزید اور اشتر جرعہ (قادسیہ کے قریب ایک جگہ) پہنچ گئے، یہاں ان کی ملاقات حضرت سعید سے ہوئی تو انھوں نے خوب ہنگامہ کیا۔ حضرت سعید نے جنگ سے اجتناب کیا اور کہا یہ مسئلہ حل کرنے کے لیے اتنا کافی تھا کہ تم اپنا کوئی نمائندہ امیر المومنین کے پاس بھیج دیتے۔ وہ خود مدینہ پہنچے اور حضرت عثمان کو بتایا کہ اہل کوفہ ابوموسیٰ اشعری کو بطور گورنر واپس لانا چاہتے ہیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: ہم ان کی مانگ پوری کیے دیتے ہیں کیونکہ ہم چاہتے ہیں کسی کے پاس کوئی عذر یا حجت نہ رہے۔ انھوں نے اسی مضمون کا خط یزید بن قیس اور اس کے ساتھیوں کو بھی بھیجا۔ ابوموسیٰ تقرری کے بعد کوفہ پہنچے اور لوگوں سے خطاب کیا، آئندہ ایسی حرکت نہ کرنا اطاعت اور جماعت سے چپکے رہنا۔ انھوں نے نماز پڑھانے سے پہلے ان سے امیر المومنین عثمان بن عفان کے لیے سمع و طاعت کا وعدہ لیا۔

حضرت عثمان کے خلاف مہم چلانے میں عبداللہ بن سبا (ابن سودا) نے بھی اہم رول ادا کیا۔ صنعا کا رہنے والا یہ یہودی عہد عثمانی ہی میں ظاہراً مسلمان ہوا۔ پہلے اس نے حجاز، بصرہ، کوفہ اور شام کے مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کی۔ یہاں کامیابی نہ ملی تو مصر جا پہنچا جہاں اسے اپنی ضلالت پھیلانے کا موقع مل گیا۔ وہ لوگوں سے

www.javedahmadghamidi.org
www.al-mawrid.org

پوچھتا کیا یہ ثابت ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں لوٹ کر آئیں گے؟ ہاں میں جواب ملنے پر کہتا، تو کیا وجہ ہے کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم جوان سے افضل ہیں نہ لوٹیں؟ پھر کہتا ہر نبی کا ایک وصی ہوتا ہے اور حضرت علی، محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وصی ہیں۔ اس طرح محمد ﷺ خاتم الانبیا اور حضرت علی خاتم الاوصیا ہوئے لیکن عثمانؓ نے وصی رسول ﷺ کا حق چھین لیا ہے۔ تنقید ہوئی تو اس نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا پرچار کرنا شروع کر دیا، اس کے ساتھ ساتھ حضرت عثمان کے گورنروں پر طعنہ زنی کرتا۔ کئی مصری اس کے فتنے کا شکار ہو گئے تو اس نے کوفہ و بصرہ میں اپنے ہم خیالوں سے خط و کتابت کر کے خلیفۂ ثالث کے خلاف بغاوت میں ساتھ دینے کا وعدہ لیا۔ اس کے ساتھیوں نے ہر شہر میں اپنے فسادی ساتھیوں سے مکاتبت کی، اس طرح سبائی خیالات کی حامل چٹھیاں (پمفلٹ) ہر طرف پہنچ گئیں۔ حضرت عثمان کو ان سرگرمیوں کا پتا چلا تو انھوں نے صحابہ کے مشورے سے محمد بن مسلمہ کو کوفہ، اسامہ بن زید کو بصرہ، عمار بن یاسر کو مصر اور عبداللہ بن عمر کو شام بھیجا تاکہ وہ ان صوبوں کی صورت حال کا جائزہ لے کر ان کو رپورٹ دیں۔ ان سب کو عوام کی طرف سے کوئی شکایت نہ ملی تاہم اہل مدینہ نے بتایا کچھ لوگوں کو مارا پیٹا گیا اور کچھ کو گالی گلوچ کی گئی ہے۔ یہ دیکھتے ہوئے سیدنا عثمان نے ہر شہر میں خط بھجوا دیے جس کسی کا مجھ پر یا میرے عمال پر کوئی حق نکلتا ہے ایام حج میں دعویٰ کر سکتا ہے۔ انھوں نے گورنروں سے مشورہ بھی کیا۔ گورنر بصرہ سعید بن عاص نے حسب سابق افواہیں پھیلانے والے سازشیوں کو قتل کرنے کا سجھاؤ دیا۔ گورنر شام حضرت معاویہ نے نرمی کے ساتھ ساتھ سختی سے کام لینے کی ضرورت پر زور دیا۔ بوقت رخصت انھوں نے کہا امیر المومنین آپ شام منتقل ہو جائیں تو حالات قابو میں آ جائیں گے۔ حضرت عثمان نے فرمایا: میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا پڑوس کسی قیمت پر نہ چھوڑوں گا چاہے میری گردن کٹ جائے۔ حضرت معاویہ نے شام سے ایک حفاظتی دستہ بھیجنے کی پیش کش کی تو جواب ملا کیا میں نبئ اکرم ﷺ کے ہمسایوں اور دار ہجرت و نصرت میں رہنے والوں کو تنگی میں مبتلا کر دوں؟ آخر کار انھوں نے کہا امیر المومنین آپ کو قتل کر دیا جائے گا یا آپ سے جنگ کی جائے گی۔ حضرت عثمان نے فرمایا: مجھے اللہ ہی کافی ہے وہ بہترین کارساز ہے۔ اس موقع پر کچھ صحابہ نے عبداللہ بن خالد اور مروان کو عطیات دینے پر اعتراض کیا تو حضرت عثمان نے ان سے مذکورہ رقوم واپس وصول کیں۔

۳۴ھ میں حضرت عثمان کے نکتہ چینوں کی تعداد بڑھ گئی۔ صحابہ میں سے حضرات زید بن ثابت، ابو اسید

ساعدی، کعب بن مالک اور حسان بن ثابت ان کا دفاع کرتے۔ ایک بار معترضین حضرت علی کے پاس آئے اور امیر المومنین سے بات کرنے کو کہا۔ حضرت علی، حضرت عثمان کے پاس پہنچے اور کہا جیسے اللہ کے ہاں امام عادل سے بڑھ کر کوئی صاحب فضیلت نہیں، اسی طرح غیر منصف حکمران سے زیادہ برا کوئی نہیں ہو سکتا۔ حضرت عثمان نے جواب دیا، علیؓ اگر تم میری جگہ ہوتے تو میں تمھیں صلۂ رحمی کرنے پر کبھی ہدف ملامت نہ بناتا۔ کیا حضرت عمر نے مغیرہ بن شعبہ کو اپنا رشتہ دار ہوتے ہوئے والی مقرر نہیں کیا تھا؟ حضرت علی نے کہا حضرت عمر جس کو ذمہ داری دیتے اس کے کان بھی کھینچتے جب کہ آپ اپنے رشتہ داروں سے نرمی برتتے ہیں۔ حضرت عثمان نے کہا یہ تمھارے رشتہ دار بھی ہیں۔ حضرت علی نے جواب دیا ہاں! میرا ان سے قریبی رشتہ ہے لیکن دوسرے لوگ ان سے زیادہ صلاحیت رکھتے ہیں۔ اس پر سیدنا عثمان نے کہا تم جانتے ہو، حضرت عمر نے ساری خلافت حضرت معاویہ کو سونپ رکھی تھی۔ حضرت علی نے جواب دیا، آپ کے علم میں یہ بھی ہو گا، معاویہ، عمر سے ان کے غلام یرفا سے بڑھ کر ڈرتے تھے۔ حضرت عثمان نے اس بات کی تائید کی تو حضرت علی نے کہا حضرت معاویہ آپ سے پوچھے بغیر فیصلہ کرتے ہیں اور لوگوں کو بتاتے ہیں، یہ امیر المومنین کا حکم ہے پھر آپ اس فیصلے کو تبدیل بھی نہیں کرتے۔ حضرت علی کے جانے کے بعد حضرت عثمان منبر پر چڑھے اور بڑے جوش سے کڑک کر لوگوں سے خطاب کیا، ہر شے کی ایک آفت اور ہر کام کے لیے کوئی مصیبت ہوتی ہے۔ اس امت کی آفت عیب جو اور طعنہ زن ہیں، دکھاتے ہیں جو تمھیں بھلا لگتا ہے اور جو تم کو پسند نہ ہو چھپا لیتے ہیں۔ بخدا تم نے میرے وہ وہ نقص نکالے جو ابن خطاب کے لیے برداشت کرتے رہے۔ وہ تمھیں ٹھوکر مارتے، پیٹتے اور برا بھلا کہتے اور تم ان کی بری بھلی بات تسلیم کرتے رہے۔ میں نے تمھارے لیے کندھے جھکا لیے، ہاتھ اور زبان کو روکے رکھا، اس لیے مجھ پر زبان درازی کرتے ہو۔ اس موقع پر مروان بن حکم نے کہا آپ چاہیں تو ہم اپنے اور ان کے بیچ تلوار کو فیصلے کا اختیار دے دیں۔ حضرت عثمان نے فرمایا: خاموش! تمھارے بولنے کا کیا مطلب؟ مجھے اپنے ساتھیوں سے بات کرنے دو۔

بصرہ و کوفہ میں سبائی فتنہ گروں کی دال نہ گلی تو انھوں نے مدینہ پر یلغار کرنے کا فیصلہ کیا۔ صحابہ کی اولاد میں سے بھی کچھ لوگ ان کے ساتھ تھے۔ یہ مصر میں پروان چڑھے تھے اور ابن ابی سرح کی جنگی پالیسیوں سے اختلاف رکھتے تھے۔ محمد بن ابو بکر اور محمد بن ابو حذیفہ ان میں نمایاں تھے۔ رجب ۳۵ھ کو قریباً ۶۰۰ افراد عمرو بن بدیل، عبد الرحمان

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

بن عُدیس، کنانہ بن بشر اور سودان بن حمران کی سربراہی میں مدینہ کے لیے روانہ ہوئے۔ بظاہر عمرہ، لیکن دراصل امیر المومنین کے خلاف مہم چلانا ان کا مقصد تھا۔ محمد بن ابو بکر نے اس قافلے میں شمولیت کی جب کہ محمد بن ابو حذیفہ نے مصر میں رہ کر رائے عامہ کو متاثر کرنے کا فیصلہ کیا۔ ابن ابی سرح نے حضرت عثمان کو ان کی روانگی کی اطلاع دے دی۔ جب وہ مدینہ کے قریب پہنچے تو انھوں نے حضرت علی کی ذمہ داری لگائی کہ انھیں مدینہ میں داخل ہونے سے روکیں۔ وہ معززین کی ایک جماعت لے کر نکلے، حضرت عمار بن یاسر، حضرت عثمان کے اصرار اور حضرت سعد بن ابی وقاص کے کہنے کے باوجود شامل نہ ہوئے۔ حضرت علی نے باغیوں کے تمام اعتراضات کا جواب دیا۔ انھوں نے کہا، حضرت عثمان نے اپنے ڈھور ڈنگروں کے لیے نہیں بلکہ بیت المال کے اونٹوں کے لیے چراگاہ بنائی۔ انھوں نے مصحف کے وہ نسخے جلائے جو مختلف فیہ تھے اور متفق علیہ باقی رہنے دیے۔ انھوں نے مکہ میں کامل نماز اس لیے ادا کی کیونکہ وہاں ان کا سسرال تھا اور وہ قیام کی نیت رکھتے تھے۔ انھوں نے نوعمر گورنر اس لیے مقرر کیے کیونکہ وہ ذی صلاحیت اور عادل تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ۲۰ سالہ عتاب بن اسید کو مکہ کا گورنر اور نوجوان اسامہ بن زید کو سپہ سالار مقرر فرمایا تھا۔ سیدنا عثمان نے اگر اپنی قوم بنو امیہ کو ترجیح دی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی قوم قریش کو باقیوں پر ترجیح دیتے تھے۔ حضرت علی نے ان کو خوب ڈانٹا اور برا بھلا کہا تو وہ شرمندہ ہوئے اور یہ کہتے ہوئے پلٹ گئے کیا ان کی وجہ سے تم امیر سے جنگ کر رہے ہو؟ ان کے جانے کے بعد سیدنا عثمان نے لوگوں سے خطاب کیا اور ان اصحاب سے معذرت جنھیں ان کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچی تھی۔

اہل مصر کی سازشیں ختم نہ ہوئی تھیں۔ انھوں نے کوفہ و بصرہ میں اپنے ساتھیوں سے پھر سے مراسلت کی، کچھ جعلی خط حضرت علی، حضرت طلحہ اور حضرت زبیر کی جانب سے تحریر کیے گئے جن میں قتال پر اکسایا گیا تھا۔ ۲۵ شوال ۳۵ھ کو مصر سے ۶۰۰ سے زیادہ اشخاص غافقی بن حرب کی قیادت میں بظاہر حج کے لیے روانہ ہوئے۔ اصل میں یہ ۴ فوجی دستوں میں منظّم تھے، عبدالرحمان بن عُدیس، کنانہ بن بشر، سودان بن حمران اور قتیرہ بن فلان کے پاس دستوں کی سربراہی تھی۔ ابن سودا (عبداللہ بن سبا) بھی ان کے ساتھ تھا۔ اسی طرح کوفہ سے بھی ۶۰۰ افراد پر مشتمل ۴ دستے عمرو بن اصم کی سرکردگی میں نکلے۔ دستوں پر زید بن صُوحان، اشتر نخعی، زیاد بن نصر اور عبداللہ بن اصم مقرر تھے۔ بصرہ سے خروج کرنے والی ۴ ٹولیوں کا لیڈر حُرقوص بن زہیر تھا۔ ان کی مجموعی تعداد پہلے دونوں گروہوں جتنی تھی۔ حُکیم بن

حبلہ، ذریح بن عباد، بشر بن شریح اور ابن محرش ٹولی کمانڈر تھے۔ اہل مصر حضرت علی کو بصرہ والے حضرت طلحہ کو اور کوفی حضرت زبیر کو خلیفہ بنانا چاہتے تھے۔ ایک مقصد ہونے کے باوجود وہ الگ الگ سفر کر رہے تھے ہر ایک کو اپنی کامیابی کا یقین تھا۔ مدینہ کے قریب آئے تو بصری ذوخشب میں ٹھہرے کوفی اعوص میں اترے جب کہ اہل مصر نے ذوالمروہ میں قیام کیا۔ پہلے دو آدمیوں نے مدینہ جا کر حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر اور امہات المومنین سے ملاقات کی۔ پھر ہر گروپ کا وفد مذکورہ اصحاب رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، تینوں نے ان کی مدد کرنے سے انکار کیا اور انھیں لعنت ملامت کی۔ باغیوں نے یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ وہ اپنے شہروں کو واپس جا رہے ہیں اپنی قیام گاہیں چھوڑ دیں لیکن پھر پلٹ کر شہر پر حملہ آور ہو گئے۔ انھوں نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کر لیا اور اعلان کیا جو مزاحمت نہ کرے گا امن پائے گا۔ ایام حج ہونے کی وجہ سے مدینہ پہلے ہی خالی تھا، باقی لوگ بھی گھروں میں بیٹھ گئے۔ صحابہ باغیوں کو سمجھاتے رہے لیکن انھوں نے ایک نہ مانی۔ اسی دوران میں حضرت عثمان دوسرے شہروں میں مدد کے لیے خطوط لکھ چکے تھے چنانچہ حضرت معاویہ نے حبیب بن مسلمہ فہری اور ابن ابی سرح نے معاویہ بن حدیج کو بھیجا، کوفہ سے قعقاع بن عمرو آئے۔ باغیوں کے خروج کے بعد پہلا جمعہ آیا تو حضرت عثمان نے خطبہ دیا، او دشمنو! اللہ سے ڈرو۔ اہل مدینہ جانتے ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے تم پر لعنت کی گئی ہے۔ محمد بن مسلمہ تائید کے لیے اٹھے تو حُکیم بن حبلہ نے انھیں بٹھا دیا۔ زید بن ثابت اٹھ ہوئے تو محمد بن ابوقتیرہ ان کی طرف لپکا۔ اب تمام باغی اٹھ کھڑے ہوئے اور نمازیوں پر سنگ باری شروع کر دی۔ حضرت عثمان کو بھی پتھر لگا اور وہ بے ہوش کر منبر سے گر پڑے۔ مدینہ پر یورش کے ایک ماہ بعد تک وہ نماز کی امامت کرتے رہے پھر انھیں روک دیا گیا اور غافقی بن حرب نے مصلّا سنبھال لیا۔

(باقی)

---

مطالعۂ مزید: تاریخ الامم والملوك (طبری)، البدایہ والنہایہ (ابن کثیر)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

## تبصرہ کتب

نعیم احمد بلوچ

# تہذیبی نرگسیت

مصنف: مبارک حیدر

صفحات: ۱۳۹، مجلد

قیمت: ۱۵۰ روپے

اشاعت: ۲۰۰۹

پبلشرز: سانجھ، ٹمپل روڈ لاہور

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

کم وبیش ہر معاشرے میں کوئی نہ کوئی فکری ونظری بحث جاری رہتی ہے۔ اس کی نوعیت البتہ ایسی کبھی کبھار ہی ہوتی ہے کہ اس پر قوموں کی بقا کا دارومدار ہو، مثلاً انقلاب فرانس (1799–1789) میں نظام حکومت کی بحث، ابراہم لنکن (1865– 1861) کے دور میں غلامی کی بحث، جنگ عظیم دوم کے بعد (1945) آزاد انڈیا کو اقتدار کی منتقلی کی بحث وغیرہ۔ قومیں اگر ان بحثوں کے بعد کسی متفقہ نتیجے پر نہ پہنچیں یا سامنے کی حقیقتوں کو قبول کرنے سے انکار کر دیں تو پھر فرشتوں کے وہ خدشات مجسم حقیقت بن جاتے ہیں جو انھوں نے آدم کی خلافت کے خدائی منصوبے کے وقت ظاہر کیے تھے اور قتل وغارت گری کے ایک سیلاب کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ پاکستان بھی اس وقت ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے۔ دہشت گردی کے خلاف جنگ ہماری جنگ ہے یا امریکہ کی، طالبان اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ ہیں یا مخصوص فہم اسلام کے بزور نفاذ کی انتہا پسندانہ اور منتقمانہ جدوجہد۔ اسلامی انقلاب، اسلام کا نعرہ ہے یا حقیقت کچھ اور ہے؟ زیر تبصرہ کتاب میں ایسے ہی موضوعات کو زیر بحث لایا گیا ہے۔

۲۶ ابواب پر مشتمل اس کتاب کو بنیادی طور پر تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ پہلے آٹھ ابواب میں مصنف نے انتہائی مہارت سے ان تمام سیاسی، تہذیبی اور مذہبی عقائد کا بے لاگ تعارف کرایا ہے جن کی بنیاد پر ہر ''باشعور

مسلمان'' پاکستان اور پھر پوری دنیا پر غلبہ اسلام کے خواب دیکھ رہا ہے۔ عام طور پر ان نظریات کو مقدس قسم کی اصطلاحات کے لبادے میں بیان کیا جاتا ہے لیکن مصنف نے ''حکومت الٰہیہ''، ''اظہار دین''، ''خلافت اسلامیہ'' وغیرہ جیسی تراکیب کے تمام لبادے اتار کر اسلامی تحریکوں کی اصل منزل بیان کر دی ہے۔ ایسا کرتے ہوئے وہ ان افکار پر کاٹ دار تبصرے بھی کرتے ہیں اور طنز و تعریض کے نشتر بھی چلاتے ہیں۔ ایک اقتباس ملاحظہ کریں:

''یہ عجیب ہے کہ جب ہم موجودہ تحریکی نظریات کو اس انداز سے بیان کرتے ہیں تو عام قاری اسے طنز اور مزاح خیال کرتا ہے۔ ممکن ہے کچھ لوگ برہم بھی ہوں کہ اسلامی تحریکوں کو طنز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے لیکن یہ ایک سوے اتفاق ہے جبکہ درحقیقت یہ نقشہ طنزیہ نہیں بلکہ یہ نظریاتی خاکہ اور تحریک کے مستقبل کا یہ پلان ایک ریسرچ پر مبنی ہے جو مختلف دینی طلباء اور اساتذہ سے رجوع کرنے کے بعد تیار کیا گیا ہے، جماعت اسلامی کے لٹریچر کے علاوہ اخوان المسلمین کے قائد سید قطب کی تحریروں کا مطالعہ کیا گیا ہے، بھارت، برطانیہ، سپین اور دیگر ممالک کی مسلم تنظیموں کے نعروں اور منشوروں کو دیکھا گیا ہے۔ یہ نظریاتی خاکہ حتی المقدور مبالغہ سے پرہیز کرتے ہوئے بیان کیا گیا ہے لیکن اس کے مبالغہ آمیز دکھائی دینے کی وجہ یہ ہے کہ آج کا عام پڑھا لکھا مسلمان جدید دور کی فکری تحریکوں سے متاثر ہوا ہے جن میں انسانی حقوق، آزادی رائے اور جمہوریت کے تصورات ایسے تصورات ہیں جن کے سامنے اسلام کے وہ تصورات ایک خاص انداز سے پس ماندہ دکھائی دیتے ہیں جو مدرسوں میں یا غلبہ اسلام کی تحریکوں میں پائے جاتے ہیں۔ لہٰذا جب ان کا بیان ان کے اصل اور بے تکلف انداز سے کیا جاتا ہے تو شاید مزاحیہ، غیر سنجیدہ یا مبالغہ آمیز دکھائی دیتا ہے۔'' (صفحہ: ۲۶-۲۷)

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

اسلام کے سیاسی غلبے کے لیے برسر پیکار مجاہدین کو پوری دیانت داری سے تلخ حقائق کا ادراک ان الفاظ سے کراتے ہیں:

''اگر مسلم امہ کی فکری حالت نہیں بدلی تو اس کا مطلب یہ نہیں کہ دنیا بھی نہیں بدلی۔ صدیوں سے خود پسندی اور ملی فخر کے جس غار میں ہمیں سلایا گیا ہے وہ اس وقت ایک سفاری پارک میں بدل چکا ہے جس کے گرد ایک مضبوط باڑ ہے اور غالباً لوہے کی اس باڑ میں ہائی وولٹیج کرنٹ چھوڑ دیا گیا ہے جس کا کنٹرول روم ہمیں معلوم نہیں۔ ہم شیر ہیں، ہم شاہین ہیں، ہم غازی ہیں اور شہادت ہماری آرزو ہے، لیکن اس دنیا کی اقوام اس جنگل سے نکل آئی ہیں جہاں ہم بادشاہ تھے۔ اب ایک اور طرح کا جنگل ہے جہاں ہم سے بھی بڑی بلاؤں کی حکومت ہے ہم ان بلاؤں کی تفریح گاہ میں رہتے ہیں اور یہ بلائیں اپنے تفنن طبع کے لیے اس سفاری پارک میں کبھی چنے پھینکتی ہیں اور کبھی کنکر، کیونکہ ان کے حساب سے ہم شیر بھی نہیں، بلکہ محض چنے چبانے والی کوئی مخلوق ہیں، جن سے وہ کبھی کبھی اپنے عوام کو ڈرانے کا کام لیتی ہیں''۔ (صفحہ ۲۳ - ۲۴)

کتاب کے اس حصے سے ہم ان دو اقتباسات ہی پر اکتفا کرتے ہیں، ورنہ سچی بات یہی ہے کہ ان ابواب کا لفظ لفظ وہ آئینہ ہے جس میں بسم اللہ کے گنبد میں بند اسلامی تحریک کے دانشور اور کارکن، دونوں ہی اپنا وہ چہرہ دیکھ سکتے ہیں جو ان کے ناقدین کے ہاں ان کا اصل تشخص ابھارتا ہے۔ مصنف نے جا بجا اپنے مخاطب سے چبھتے ہوئے سوالات بھی پوچھے ہیں اور زبان حال سے دریافت کیا ہے ان سامنے کے حقائق کو نظر انداز کر کے کسی صائب فیصلے پر کیسے پہنچا جا سکتا ہے۔ وہ پوچھتے ہیں:

''کیا قومی آزادی کسی دوسری قوم سے نفرت کے بغیر ممکن نہیں؟ کیا جدید جاپان، ملائیشیا یا چین کی ترقی کسی مخالف قوم سے نفرت کی بنیاد پر ہوئی ہے؟ کیا بھارت سے نفرت کے نتیجے میں یا اسلام کا بڑھ چڑھ کر نعرہ لگانے سے ہم نے پچھلے ساٹھ برس میں ترقی کی ہے؟'' (صفحہ ۴۱)

تبلیغی جماعت سے پوچھتے ہیں:

''دوسرے ملکوں میں جانے سے پہلے آپ اپنے ملک کے عوام کا کردار اور اخلاق کیوں نہیں سنوارتے؟ اور جب تک یہ سنور نہ جائے، کیا آپ کا بیرون ملک جانا جائز ہے؟'' (صفحہ ۴۴)

جہادی مذہبی قیادت سے پوچھتے ہیں:

''ایسا (کیوں) دیکھنے میں نہیں آیا کسی چیرہ دست ظالم کو، کسی ذخیرہ اندوز کو یا ہیبت ناک مالی سکینڈل کے ذریعے راتوں رات ارب پتی بن جانے والے کسی شخص یا گروہ کو ان جہادی تنظیموں نے نشانہ بنایا ہو؟'' (صفحہ ۴۶)

کتاب کے دوسرے حصے میں مصنف نے اس مرض کی تشخیص کی ہے جو ان کے خیال میں ہم مسلمانوں کے ہاں ہر سطح پر پایا جاتا ہے۔ باب نو سے سترہ تک وہ اپنے اسی مقدمے کے حق میں دلائل دیتے نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں مسلم ذہن میں خود پسندی اس حد تک سرایت کر چکی ہے ہم ''نرگسیت'' کے نفسیاتی مرض کا شکار ہو چکے ہیں۔ اس کے حق میں متعدد علماے نفسیات کے حوالے سے انھوں نے ۱۱۶ ایسے خصائص بیان کیے ہیں جو نرگسیت کے مریض میں پائے جاتے ہیں۔ پھر انھوں نے تجزیہ کر کے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یہ ساری علامات مسلمانوں میں پائی جاتی ہیں۔ مصنف کو احساس ہے کہ ہر دور کی عالمی طاقت اسی طرح کی ذہنیت کا مظاہرہ کرتی ہے لیکن ان کے نزدیک موجودہ عالمی طاقت امریکا کا معاشرہ اس کے مضر اثرات سے بوجوہ محفوظ ہے۔ اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں؛

''امریکہ میں بہترین جمہوری حقوق کے مروج ہونے کے باوجود یا شاید ان کی وجہ سے امریکی فرد کی انفرادی نرگسیت اور امریکہ کی ریاستی نرگسیت میں وہ یکسانیت پیدا نہیں ہو پاتی جو پاکستان یا سعودی عرب کے کرخت آمرانہ معاشروں میں ملتی

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ اظہار رائے کی آزادی اور اختلاف کا حق اس امر کی ضمانت بنتے ہیں کہ ہر طرح کی نرگسیت پر تنقید اور نگرانی ہوتی رہے چنانچہ فرد کی نرگسیت پر اجتماعی چھاپ نہیں لگتی۔اس کے برعکس آمرانہ معاشروں میں چونکہ قبائلی جبر اور آمرانہ نظام فرد کی آزادانہ نشوونما کو روکتے ہیں اور معاشرہ تنوع سے محروم ہو جاتا ہے لہٰذا افراد اور معاشرے کی نرگسیت میں یکسانیت پیدا ہوتی چلی جاتی ہے۔'' (صفحہ ۶۴)

لیکن اس موقع پر قاری کے اس فطری سوال کا جواب نہیں دیا گیا کہ عراق کے خلاف بلا جواز جارحیت کے متوقع اقدام کو جب ان جمہوری معاشروں نے رد کیا تو کیا تو اس کا لحاظ نہ کرنا کون سی جمہوری روایت کے مطابق تھا؟ کیا اس موقع پر امریکا کی ریاستی نرگسیت کے آگے امریکی، برطانوی، فرانسیسی اور دوسری متعدد یورپی اقوام کی انفرادی نرگسیت کوئی موثر بند کیوں نہ باندھ سکی؟ البتہ انھوں نے مسلم نرگسیت کی یہ وجہ بہت خوب بیان کی ہے:

''مملکت سے بغاوت کے جو مظاہر پاکستان میں دکھائی دے رہے ہیں وہ صرف ایک ایسے نرگسی معاشرے میں ممکن ہے جہاں فرد یا گروہ خود کو مملکت سے بڑا یا برابر سمجھتا ہے اور دوسری طرف مملکت فرد کو کسی آئینی اور قانونی اصول سے تبدیلی کا موقع فراہم نہیں کرتی، یعنی فرد اور مملکت اپنی اپنی نرگسیت کا اظہار کر رہے ہیں۔ یہ اس صورت میں ہوتا ہے جب قوم اور مملکت کے تصورات افراد کی نظر میں قبل احترام تصورات نہ ہوں بلکہ ان کی جگہ کسی دوسرے تصور اجتماعیت کو تقدس حاصل ہو۔ چونکہ پاکستانی معاشرے میں فکری طور پر مذہبی حکمرانی کو تقدس حاصل ہے اور عملی طور پر جابر اور عسکری قوت کو یہ حق حاصل ہے لہٰذا قومی اور ملکی تشخص بتدریج بے معنی ہوتا جا رہا ہے۔'' (صفحہ ۶۳۔۶۴)

www.javedahmadghamidi.com www.al-mawrid.org

کتاب کے آخری نو ابواب میں مصنف نے اپنی رائے کے مطابق ان غلط افکار کی نشان دہی کی ہے جس کی وجہ سے مصنف کے بقول مسلمان نرگسیت کا شکار ہوئے ہیں۔ اس ضمن میں انھوں اسلام کے مکمل ضابطہ حیات ہونے کے خود ساختہ عقیدے کو بجا طور پر ہدف تنقید بنایا ہے۔ غلبہ اسلام کے عنوان سے انھوں نے اس بات کو سادہ انداز سے رد کر دیا ہے بھلا آج کے دور میں سر فتح کر کے غلبے کی آرزو کیسے پوری کی جاسکتی ہے؟ اور ان کا یہ کہنا بھی سو فی صد درست ہے کہ آج اگر حضور ﷺ خود موجود ہوتے تو وہ نام نہاد جہادیوں کی پر تشدد تحریکوں کے بجائے سفارت اور مکالمے کے ذریعے دل و دماغ کو فتح کرنے کو ترجیح دیتے۔ جہاد اور سنت کے مروجہ تصورات پر بھی ان کی تنقیدات جان دار اور قاری کو اپنے دل کی بات محسوس ہوں گی البتہ انھوں نے دین اسلام میں سنت اور جہاد کا جو تصور بیان کیا ہے اس سے اتفاق کرنا مشکل محسوس ہوگا۔

یہ درست ہے کہ مصنف نے عمومی طور پر عقل عام ہی کے ذریعے اپنے تجزیے کو درست ثابت کرنے کی کوشش کی ہے جس میں وہ بہت حد تک کامیاب رہے ہیں لیکن بعض جگہوں پر انھوں اس مناسب روش سے ہٹ کر خالص

علمی وفنی نوعیت کی تنقید بھی کی ہے لیکن ایک تو کتاب کا اسلوب اس کے لیے مناسب نہیں ہے دوسرے یہ کہ شاید زیر بحث موضوعات سے انصاف کے تقاضے پورے کرنا ان کے لیے ممکن نہیں تھا۔ مثلاً صفحہ ۹۲ پر انھوں ایک عربی مقولے کو حدیث قرار دیا ہے کہ علم حاصل کرو چاہے تمھیں چین جانا پڑے (ملاحظہ ہو کتاب: مقالات عبدالقدوس ہاشمی)، اسی طرح نوشیرواں عادل ایرانی ضرور تھا لیکن اس کا عدل کسی تہذیبی روایت سے ماخوذ نہیں تھا بلکہ اس کی ساری اخلاقیات کا منبع اللہ کی دی ہوئی فطرت اور اس کے انبیاء کی تبلیغ کردہ تعلیمات تھیں اور قرآن نے اس کا ذکر ذوالقرنین کے لقب سے کیا ہے۔ اور اس کی حکومت ہرگز عربوں نے ختم نہیں کی (تفسیر ترجمان القرآن از مولانا ابوالکلام آزاد) سنت کے حوالے سے ان کے ارشادات خلط مبحث کا شکار ہیں۔ یہ تو بالکل درست ہے کہ بطور نبی آپ کا اسوہ مبارک اور بطور انسان آپ کے وہ اعمال جو آپ نے ذاتی حیثیت سے انجام دیے، ان میں فرق کیا جائے گا، لیکن سنت کی متعین تعریف کیا ہو گی، اسے انھوں نے بیان نہیں کیا۔ بدر کے قیدیوں کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سورہ محمد کے عین مطابق تھا، اور اس پر اللہ تعالیٰ نے نعوذ باللہ کسی ناپسندیدگی کا اظہار نہیں کیا، ناپسندیدگی والی روایت درست نہیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیے ''حیات رسول امی'' از خالد مسعود) حضرت عائشہ صدیقہ سے کنارہ کشی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فیصلہ نہیں بلکہ ازواج مطہرات سے متعلق خاص قانون کا ایک مرحلہ تھا، جسے اللہ کے حکم سے اختیار کیا گیا تھا۔ (دیکھیے میزان از جاوید احمد غامدی، صفحہ ۴۷۱)۔ اسی طرح صفحہ ۹۷ میں بیان کردہ اس بات میں کوئی حقیقت نہیں ہے کہ جید صحابہ نے حضرت عثمان کو خلافت سے دست بردار ہونے کا مشورہ دیا تھا۔ دراصل وہ تو فسادی اور باغی یہ کہہ رہے تھے کہ آپ خلافت سے علیحدہ ہو جائیں۔ (تفصیل کے لیے دیکھیں ''خلافت معاویہ و یزید از علامہ عباسی) روح کے حوالے سے بھی انھوں نے جو بیان کیا ہے اس سے متفق ہونا مشکل ہے۔ قرآن میں روح کا لفظ چار دفعہ آیا ہے، وہاں یہ لفظ پھونک، امر ربی، وحی اور جبریل علیہ السلام کے معنوں میں استعمال ہوا ہے، جبکہ فلسفے میں روح کا لفظ اس اصل انسانی شخصیت کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے جو جسم سے ماورا ہے۔ یونانی اسے soul کہتے تھے اور قرآن میں اسے ''نفس'' کہا گیا ہے، لیکن مصنف کے مطابق: ''جسے ہم روح کہتے ہیں، وہ غالباً ذہن کا ایسا طبقہ ہے جو اجتماعی شعور کو عالم نامعلوم سے جوڑتا ہے''۔ یوں ''مذہب بطور روحانیت'' میں ان کے خیالات سے اتفاق نہیں کیا جا سکتا اور یہ قاری کے لیے خاصی الجھن کا باعث ہو سکتے ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ڈارون کی کتاب Origion of Species جس دن (24 نومبر 1859) مارکیٹ میں آئی اسی دن فروخت ہو گئی۔ غیر معیاری نثر میں لکھی گئی اور انتہائی متنازعہ موضوع کی حامل کتاب ہونے کے باوجود اس کی پذیرائی

نے ثابت کر دیا تھا کہ آیندہ صدی میں یورپ علم وفنون کا امام ہو گا۔ زیر تبصرہ کتاب اگرچہ خوب صورت نثر کا ایک معیاری نمونہ ہے اوراس میں بیان کے گئے تلخ حقائق، اٹھائے گئے لاجواب سوالات، دکھی دل کے ساتھ بیان کیے گئے تیکھے نکات اور مستقبل میں پیش آنے والے چونکا دینے والے تباہ کن نتائج کو جس مہارت کے ساتھ پیش کیا ہے، اس کے باوجود اس کی جتنی پذیرائی عوامی حلقوں میں ہوئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے آنے والے وقتوں میں ہمارا کیا حشر ہو گا۔ بلاشبہ اپنی تمام خامیوں کے باوجود یہ کتاب اس قابل ہے کہ اسے پاکستان کا ہر وہ فرد غور سے پڑھے جو یہ جاننے کا مشتاق ہے کہ قومیں قرآن کے الفاظ میں ''مغضوب'' اور ''ضالین'' کیسے بنتی ہیں۔ اپنے آپ کو فکری اور علمی احتساب سے ماورا سمجھنے والے اذہان جہالت کی کن پستیوں میں جا گرتے ہیں اور ان کے دل سامنے کی حقیقتوں کو قبول کرنے سے کیسے گریزاں ہو جاتے ہیں۔

خوب صورت طباعت اور بامعنی سرورق کی حامل اس کتاب میں چھیڑے گئے موضوعات پر اس طرح کی کئی کتب منظر عام پر آنے چاہییں تا کہ فکری گھٹن میں کچھ تو کمی ہو۔ اس سلسلے میں مصنف کی یہ کاوش انتہائی مبارک اور قابل صد ستایش ہے۔

www.al-mawrid.org
www.javedahmadghamidi.com

جاوید احمد غامدی

# تحفہ ملنے پر

## زروان کے نام

www.javedahmadghamidi.com
www.al-mawrid.org

جانِ بابا، یہ ارمغاں تیرا　　خوب ٹھیرا ہے ترجماں تیرا
یہ مجھے روبرو بٹھاتا ہے　　تیری باتیں مجھے سناتا ہے
تیرے احساس کی نزاکت سے　　جسم و جاں میں بھری لطافت سے
یہ مجھے ہم کلام کرتا ہے　　روح کو شاد کام کرتا ہے
میرے جذبوں میں رنگ بھرتا ہے　　میرے احساس میں اترتا ہے
جی میں آتا ہے ایک بات کہوں　　جانِ بابا، تجھے اگر دیکھوں
تم بڑے ہو کے جب کبھی آؤ　　لکھ کے، پڑھ کے جوان ہو جاؤ
لے کے آنا نماز کا تحفہ
سجدہ ہاے نیاز کا تحفہ